جلد ۷۶ اکتوبر ۱۹۷۱ء عدد ۲

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاھور

کتابیں

اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی

آپ اچھی کتابیں پڑھیں

کیونکہ

آپ کو خود اچھا بننا ہے
اور دوسروں کو اچھا بنانا ہے

اچھی اچھی کتابوں کا مرکز

مکتبہ الخیر : جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اکتوبر ۱۹۷۱ء مطابق شعبان ۱۳۹۱ھ	جلد ۷۶

مغربی پاکستان		مشرقی پاکستان
چندہ سالانہ: آٹھ روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور	سالانہ (ہوائی ڈاک) ۱۰ روپے
فی پرچہ: ۸۰ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور	فی پرچہ " ۹۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

مشرقی پاکستان میں فتنہ و فساد کی جو خوفناک آگ بھڑکائی گئی تھی اور جس کی دبی ہوئی چنگاریاں اب بھی وقتاً فوقتاً سلگ کر امنِ عامہ کو برباد کر رہی ہیں، یہ کوئی ایسا غیر متوقع حادثہ نہیں جسے بخت و اتفاق پر محمول کیا جا سکے۔ پاکستان کے سیاسی اُفق پر کئی سالوں سے ذہنی خلفشار اور فکری انتشار کا جو دھواں اُٹھ رہا تھا وہ اس بات کی واضح شہادت فراہم کر رہا تھا کہ زیرِ زمین آگ لگی ہوئی ہے مگر ہمارے اربابِ اختیار نے اقتدار کی رسہ کشی میں اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہ دی بلکہ بعض حالات میں جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس کے بھڑکنے سے اُن کے اقتدار کی مدت میں توسیع ہو سکتی ہے تو انھوں نے اس جلتی ہوئی آگ کو ایندھن فراہم کیا اور اس طرح اس بات کا التزام کیا کہ اس کے شعلے فرو نہ ہونے پائیں۔

ماضی میں تو خیر جو کچھ ہوا سو ہوا مگر افسوس کہ اس وسیع پیمانے پر ملک کی بربادی دیکھنے کے باوجود اس ملک کے رہنے والوں کی آنکھیں نہیں کھُلیں اور انہیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ اس قوم کے حقیقی خیر خواہ کون ہیں اور اس کے بد اندیش کون لوگ ہیں۔ کسی قوم کے سامنے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر اس کی زندگی اور اس کی تگ و دو کا مقصد کیا ہے؟ اس کے پاس نصب العین کی وہ کونسی مقناطیسی کشش ہے جو اس کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھ سکتی ہے؟ اور اس کے پاس وہ کونسا ضابطۂ اخلاق اور قانون ہے جو اس کے مختلف افراد اور طبقوں کے درمیان توازن پیدا کر کے ان کی زندگی کو عدل و انصاف کی بنیاد پر اُستوار کر سکتا ہے؟ کسی دوسری قوم کے لیے تو ہو سکتا ہے کہ ان سوالات کا کوئی معقول جواب ممکن نہ ہو یا اگر کوئی جواب ممکن بھی ہو تو اس کی صحت محلِ نظر ہو، یا اس کی صحت کو تجربے کی کسوٹی پر جانچ پرکھ کر دیکھ نہ لیا گیا ہو۔ مگر مسلم قوم کے لیے

ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی ایسا نہیں جس کا اس کے پاس ہر لحاظ سے اطمینان بخش جواب موجود نہ ہو اور جسے طویل تاریخی تجربے کی روشنی میں سو فیصد صحیح ثابت نہ کیا جا چکا ہو اور پھر عقلِ سلیم نے اس کی تصدیق نہ کر دی ہو۔ مسلم قوم کے نصب العین، اس کے ضابطۂ اخلاق، اس کی ملی اساس، اس کے اجتماعی نظم، اس کے قومی شعور، اس کے فکر و نگاہ کے زاویوں اور اس کے عمل کے میدان کے مابین کوئی بُعد بھی پایا نہیں جاتا۔ ان سب کے درمیان اس قسم کی معنوی ترتیب موجود ہے کہ یہ سارے ایک ہی رُخِ زیبا کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رُخِ زیبا، خدا کا عطا کردہ نورِ ہدایت ہے جس سے زندگی کے سارے گوشے منیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے دین ہی سے اس قوم کا نصب العین متعین ہوتا ہے، اسی سے اس کا ضابطۂ اخلاق تشکیل پاتا ہے، اسی سے اس کے ملی شعور کی پرورش ہوتی ہے، اور اس کی محبت ہی ملت کے مختلف طبقوں کے درمیان اخوت و یگانگت کے احساسات کی آبیاری کرتی ہے۔ یہ دین اس قوم کی روح اور اس کا جوہرِ حیات ہے اس کے بغیر اس قوم کی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے اس ملت کے دشمن تک تو پوری طرح سمجھ چکے ہیں مگر افسوس ہے کہ خود اس کے افراد نے ابھی تک اس کا ادراک نہیں کیا۔ اس لیے اس ملت کے بدخواہ جب بھی اس کی بربادی کا کوئی پروگرام ترتیب دیتے ہیں تو اس میں سے سب سے زیادہ خیال اس بات کا رکھتے ہیں کہ مسلم قوم کو کس طرح قوت و طاقت کے اس لازوال سرچشمے سے محروم کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ زبان کی حد تک تو اس دین کی کسی نہ کسی طرح عزت و تکریم کرتے ہیں مگر عملی زندگی میں اسے کارآمد نہیں سمجھتے اور اصلاحِ احوال کے لیے جب کوئی نقشہ مرتب کرتے ہیں تو اس دین کو اس نقشے میں اس کا صحیح مقام دینے کے بجائے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہی وہ اصل سبب ہے جس کی وجہ سے ہماری ساری تدبیریں ناکام ہو رہی ہیں اور جو قدم بھی ہم آگے کی طرف بڑھاتے ہیں وہ ہمیں پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ دُور نہ جائیے صرف گذشتہ چند ماہ کے واقعات پر نظر ڈالیے تو آپ کو اس دعوے کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔

پاکستان کے مشرقی بازو کو ملک کے مجموعہ سے الگ کرنے اور مغربی بازو کے بھی حصے بخرے کرنے کے

لیے جو تحریکیں سرگرمِ عمل ہیں ان سب کا طریقِ کار یہ ہے کہ کسی طرح اس ملک میں دین کے اثرات کو زائل کیا جائے اور اس کی جگہ لادینی تحریکوں کے اثر کو بڑھایا جائے، کیونکہ دینی اثرات کے ختم ہونے سے وہ قوت ختم ہو جائے گی جو ان دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے۔ مشرقی پاکستان میں انسانی خون سے جو ہولی کھیلی گئی ہے اسے دیکھتے ہوئے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیکولر ذہن کے غیظ و غضب کا ہدف کون سا طبقہ تھا جس پر سب سے زیادہ ظلم ڈھائے گئے۔ جن لوگوں نے وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا ہے یا اخبارات کے ذریعے ظلم و تشدد کی جو روح فرسا خبریں آتی رہتی ہیں وہ اس حقیقت کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ وہاں ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس بات کی کوشش کی گئی اور اب بھی کی جا رہی ہے کہ کسی طرح دین کا علمبردار طبقہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ علماء کی ایک بہت بڑی تعداد دشمنِ دین لوگوں کی ستم رانیوں کا نشانہ بنی ہے اور ان میں سے بعض ایسی قابلِ قدر ہستیوں کو قتل کیا گیا ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں پہاڑی کے چراغ اور زمین کے نمک کی حیثیت رکھتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کو ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت تباہ کیا جا رہا ہے تاکہ علم و عرفان کے چشمے جن سے لوگ سیراب ہوتے تھے وہ برباد ہو کر رہ جائیں اور اس طرح دینی تعلیم کا یہ سلسلہ بالکل منقطع ہو جائے اور آنے والی نسلیں دینِ حق سے ناآشنا ہو کر سیکولرزم کی پرستار کی حیثیت سے دنیا میں سرگرمِ عمل ہوں۔

علم دین کے خاتمے اور علماء کے قتل کی یہ کارروائیاں کوئی اچانک شروع نہیں ہوئیں بلکہ یہ سارا کام باقاعدہ ایک تدبیر کے تحت مختلف مراحل میں ہوا ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ عوام کے ذہنوں اور خصوصاً نوجوان نسل کے ذہن میں اسلام کے بارے میں انتشار پیدا کرنا تھا۔ اس فکری انتشار کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاق کو برباد کرنے کا اس طرح التزام کیا گیا کہ اخلاقی حدود و قیود اس کی نظر میں بیکار کی زنجیریں بن کر رہ گئیں جنہیں توڑنے اور پامال کرنے میں اسے لذت محسوس ہوتی تھی۔ اِس ذہنی انتشار اور اخلاقی انحطاط کا ردِ عمل یہ ہوا کہ دین اور دین کے علمبرداروں کے خلاف اُن کے دل میں عداوت پیدا ہوئی۔ چونکہ ملک کے معاشرتی ماحول میں وہ اسلام کے خلاف کھل کر کوئی بات کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا اس لیے اس نے نفرت کا دہانہ "مولوی اور مُلّا" کے خلاف کھول دیا اور اس بیچارے پر محض اس لیے یلغار شروع کی کہ وہ اس دین کو انتہائی نامساعد حالات میں سینے سے لگائے ہوئے تھا جس کی اخلاقی ضابطوں کی پابندی اس ملک کے بگڑے ہوئے بے دین طبقے (جس کے ہاتھ میں بدقسمتی سے ملک کی زمامِ کار

بھی تھی، پریشان گزرتی تھی "مُلّا" کو معاشرے میں ذلیل اور رُسوا کرنے کے لیے اس کے خلاف مختلف اوقات میں بڑی خوفناک سازشیں کی گئیں اور ایک منصوبے کے تحت اس بیچارے کی "قتلِ سیرت" (CHARACTER ASSASSINATION) کا التزام کیا گیا تاکہ وہ کسی التفات اور توجہ کا مستحق نہ رہے اور مسلم سوسائٹی اُسے ایک سنگین گالی سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگے۔ اس "قتلِ سیرت" کے بعد جب اس بے دین طبقے کو یہ معلوم ہوا ہے کہ علماء کے حلقے میں ابھی کچھ سخت جان لوگ ایسے موجود ہیں جو ان مذموم اور ناپاک حملوں کے باوجود عزت و احترام کے ساتھ زندہ ہیں، اور ایک اچھے خاصے دائرے میں اپنے اثرات رکھتے ہیں تو اب انکی کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح انکی زندگی کے چراغ گُل کر دیئے جائیں تاکہ اس ملک میں ان کی روشنی باقی نہ رہے اور یہاں ہر طرف تاریکیاں چھا جائیں۔ مشرقی پاکستان میں علماء اور دین کے علمبردار طبقے کے قتل و غارت کا جو بازار گرم ہے وہ اسلام اور پاکستان کو تباہ کرنے کا باقاعدہ ایک منصوبہ ہے، کیونکہ اسلام کے بغیر پاکستان کا وجود بلکہ تصور بھی یکسر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ بنگلہ دیش تحریک کو جو لوگ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے چھینے ہوتے حقوق کی بازیابی کی تحریک سمجھتے ہیں وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ تخریب وطن کی یہ تحریک درحقیقت سیکولرزم کا ایک طوفان ہے جسے پوری شدت کے ساتھ اس ملک میں اٹھایا گیا ہے تاکہ اسلام کے تصورِ قومیت کی بنیاد پر قائم ہونے والی یہ مملکت صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور اس طرح اس تصورِ قومیت کی تکذیب ہو سکے۔ اگر یہ تحریک پامال حقوق کے خلاف مشرقی بازو کا فطری ردِّ عمل ہوتا تو پھر اسلام اور اسلام کے علمبرداروں کو چُن چُن کر ہلاک کرنے کی منظم کوششیں نہ کی جاتیں۔ مشرقی پاکستان کے لوگ اگر اپنے جائز حقوق سے محروم ہیں تو اس محرومی میں وہاں کے علماء بھی برابر کے شریک ہیں۔ اس بنا پر وہ بھی اسی تعاون اور ہمدردی کے مستحق ہیں جس طرح کہ مشرقی پاکستان کے دوسرے باشندے۔ مگر ان بے چاروں سے ہمدردی کرنے کے بجائے انہیں برباد کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے وجود سے اُس رشتۂ اخوت کو برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے جو اسلام نے ہماری اجتماعی شیرازہ بندی کے لیے ہمیں عطا کیا ہے اور جس کے دم قدم سے خاک و خون کے وقتی رشتے مضمحل اور کمزور ہوتے ہیں۔ "بیچارے مُلّا" کو جو اس ملک میں ایک انتہائی قبیح اور ذلیل عنصر سمجھ کر ختم کیا جا رہا ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہ فی الحقیقت ہمارے معاشرے کا سب سے زیادہ مجرم طبقہ ہے بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کے وجود سے اسلام کا نظامِ فکر و اعتقاد، نظامِ عبادت اور نظامِ معاشرت کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے اور یہ طبقہ اخلاقی بے راہروی اور مغرب پرستی کے خلاف بے سروسامانی کے باوجود سینہ سپر ہے۔ اسی وجہ سے علماء کا یہ مظلوم طبقہ سیکولرزم کے علمبرداروں کی آنکھ میں خار بن کر کھٹکتا ہے۔

کفر اسلام کے خلاف کس چابکدستی اور مہارتِ فن کے ساتھ صف آرا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر بھی اور خود پاکستان اور مسلم ممالک میں بھی وہ اس جنگ کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ لڑ رہا ہے اور جن لوگوں کو اس مقصد کے لیے اس نے میدان میں اُتارا ہے انہیں باقاعدہ ایک جنگی چال کے تحت آگے بڑھا رہا ہے۔ اس نے دین کے نام لیواؤں پر بیک وقت یلغار نہیں کی بلکہ جو طبقہ اس کے نزدیک کفر کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے پہلے اس کی سرکوبی کی فکر کی جارہی ہے۔ اس نے دین کے علمبرداروں کو ختم کرنے کے لیے جو نقشہ بنایا ہے اس میں انہیں سب سے پہلے چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا گروہ ان دینداروں پر مشتمل ہے جو اسلام کو محض عبادات اور چند اخلاقی پابندیوں تک محدود رکھتے ہیں۔ اُن کا یہ طرزِ عمل چونکہ نظامِ کفر کے لیے کوئی چیلنج نہیں رکھتا۔ اس لیے وہ بھی اس بے ضرر طبقے کو خندہ پیشانی سے برداشت کررہا ہے بلکہ مسلمانوں کو فریب دینے کے لیے وہ اس طبقے کی تعریف بھی کرتا ہے اور انہیں یہ باور کراتا ہے کہ اصل دینداری تو یہی ہے باقی سب دنیاداری ہے۔ دوسرا طبقہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو دین کے معاملے میں بظاہر فعال نظر آتے ہیں اور ان میں اجتماعی زندگی کی حرارت اور ولولے کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں مگر جن کے نظریات کافرانہ نظامِ حیات سے متصادم نہیں بلکہ اُس کے مماثل ہیں۔ یہ طبقہ بھی کفر کی نگاہ میں بڑا پسندیدہ طبقہ ہے اور وہ مذہبی احساسات رکھنے والے مغرب زدہ نوجوانوں کو اس طبقے میں شریک ہونے پر ابھارتا رہتا ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ جب کسی انسان کے فکری جہاز ایک مرتبہ بے لنگر ہوجائیں تو پھر طوفان اسے جس طرف چاہتا ہے بہا کرلے جاتا ہے۔ ان دو طبقوں کے علاوہ دین کے علمبرداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو دین کا ایک محدود تصور رکھنے کے باوجود سیاسی زندگی میں سرگرم نظر آتا ہے۔ چونکہ اجتماعی زندگی اور اُس کے معاملات میں اس کا ذہن صاف نہیں ہوتا اس لیے کفر کی طاقتیں اسے آسانی کے ساتھ استعمال کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ کفر کے لیے سب سے زیادہ خطرناک طبقہ وہ ہے جو دین کا ایک جامع تصور لے کر میدان میں اُترتا ہے اور زندگی کے ہر گام پر الحاد سے ٹکراتا ہے۔ کافرانہ نظریات کے مقابلے میں وہ اسلامی عقائد لاتا ہے اور ہر اعتبار سے اُن کی فکری برتری ثابت کرتا ہے۔ مغربی معاشرت کے مقابلے میں وہ اسلامی معاشرت اور تمدن پیش کرتا ہے۔ غیر اسلامی معیشت اور سیاست کے مقابلے میں وہ اسلامی معیشت اور سیاست کی عظمت دلوں پر ثبت کرتا ہے۔ کفر کی یورش سب سے زیادہ اسی طبقے پر ہوتی ہے کیونکہ اس کی شکست کے بعد اُسے اسلام کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ کفر خود بھی اس طبقے پر پے در پے حملے کرتا ہے۔

مگر وہ ہمیشہ ایسے مواقع کی تاک میں رہتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو دوسرے دیندار طبقوں کو اس کی دشمنی پر اُبھارا جا سکے خصوصاً جب اُسے تیسرے طبقے کی خدمات حاصل ہو جائیں تو اُسے بیحد خوشی ہوتی ہے اور وہ اس کی خدمات سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ کفر کی اس چال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سب سے پہلے چوتھے طبقے کو دوسرے دیندار طبقوں کی مدد سے ختم کیا جاتا ہے اور اس کے خاتمے کے بعد پھر انہیں بھی آہستہ آہستہ یا توڑا دیا جاتا ہے یا معاشرے میں بالکل ایک غیر مؤثر قوت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی اور دوسرے اشتراکیوں نے جماعت اسلامی کو دشمن نمبر ایک سمجھ کر تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک اُن کے ناپاک عزائم کے لیے سب سے زیادہ خطرہ اسی جماعت سے ہے۔ یہ کفر کی ساری چالوں سے بخوبی واقف ہونے کی بنا پر ہر میدان میں اسی کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لیے کفر بھی سب سے زیادہ اسی پر برافروختہ ہے اور اس کے کارکنوں اور ہمدردوں کو تاک تاک کر مار رہا ہے۔

جس طرح مشرقی پاکستان میں حالات آناً فاناً نہیں بگڑے بلکہ جو کچھ وہاں ہوا ہے وہ بتدریج ہوا ہے جس کی پیش بینی اور پیش بندی ہر مرحلے پر کی جا سکتی تھی، بالکل اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی حالات کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ اگر یہاں صورتِ حال کو بگڑنے سے بروقت نہ روکا گیا تو ملک کا یہ حصہ بھی تباہی سے محفوظ نہ رہ سکے گا اور یہاں بھی انسانی خون کی اُسی طرح ارزانی ہوگی جس کے روح فرسا مناظر ہم مشرقی پاکستان میں دیکھ چکے ہیں۔ جن حالات نے مشرقی پاکستان کو شعلہ جوالہ بنایا تھا ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس خاص قسم کی ذہنیت نے ملک کی بربادی کا سامان کیا وہ فاشسٹ ذہنیت ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جس کے تحت کوئی آمر جائز و ناجائز طریقوں سے کام لیکر اور اخلاقی یا غیر اخلاقی ہتھکنڈوں کے استعمال سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہونے کی کوشش کرتا ہے اور جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح جس طرف چاہتا ہے اقتدار کی لاٹھی سے ہانکتا چلا جاتا ہے جس طرح اشتہائے کاذب ایک جسمانی عارضہ ہے بالکل اسی طرح فاشزم ایک ذہنی بیماری ہے جو انسان کے اندر حصولِ اقتدار کا جنون پیدا کر دیتی ہے۔ جو شخص بھی اس میں مبتلا ہوتا ہے اس کے نزدیک اقتدار کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ بذاتِ خود مقصد بن جاتا ہے۔ اسے اس بات کی قطعاً کوئی تمیز

نہیں رہتی کہ اقتدار کن ذرائع سے حاصل کیا جا رہا ہے اور یہ ذرائع ملک میں تعمیری جذبات کو اُبھارنے والے ہیں یا تخریبی رجحانات کو جنم دینے والے۔ اقتدار کے اس "مجنون" کو تو صرف تختِ شاہی پر براجمان ہونے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جان بوجھ کر ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے اس کا مقصد جلد از جلد حاصل ہو۔ وہ قوم کی اخلاقی اور ذہنی تربیت نہیں کرتا بلکہ اس کے جذبات سے کھیلتا ہے۔ اور یہ جذبات بھی سراسر منفی ہوتے ہیں۔ وہ ایک علاقے یا بستی کے رہنے والوں کے دلوں میں دوسرے علاقے یا بستی کے رہنے والوں کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھارتا ہے۔ اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے حقوق بڑی بیدردی سے پامال کر رہے ہیں۔ علاقائی منافرت فاشزم کا خاصہ ہے جس سے تخریبی ذہن تیار کیے جاتے ہیں۔

فاشزم کا دوسرا حربہ تشدّد ہے۔ فاشسٹ کا کوئی کام بھی معقولیت، اعتدال، تدبّر اور امن پسندی سے طے نہیں پاتا بلکہ ہر کام عوام کے جذبات کے اندر اشتعال پیدا کر کے یا دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ فاشسٹ عناصر کی تکنیک یہ ہے کہ تعداد میں کم اور قوت میں کمزور ہونے کے باوجود وہ ملک کے اندر اور باہر یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ملک کی سب سے بڑی طاقت ہیں اور حالات کو جس رُخ چاہیں بآسانی موڑ سکتے ہیں، کوئی دوسرا گروہ اُن کی اس قوت کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس تاثر کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ جگہ جگہ تشدّد کے مظاہرے کرتے ہیں اور مخالفین اور حکومت کو ہر طرح سے مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ جو چاہیں کھلے بندوں کریں۔ عوام اُن سے خائف ہوں، حکومت اپنے ہر اقدام کے لیے ان کے اشارے کی منتظر ہو اور انتظامیہ پر عملاً اُن کا قبضہ ہو۔ دورِ جدید اور قدیم میں جن لوگوں نے بھی فاشسٹ ہتھکنڈوں سے کام لے کر عنانِ اقتدار پر قبضہ کیا ہے اُن کے لیے تشدّد اور دھونس ہی سب سے مؤثر ہتھیار ثابت ہوتے ہیں۔ ان ہتھیاروں کی مدد سے عوامی لیگ نے مشرقی بازو میں اپنا تسلّط قائم کرنے کی کوشش کی اور انہیں ہتھیاروں کو اب مغربی بازو میں بعض لوگ آزما رہے ہیں۔ حکومت کو مشرقی پاکستان کے واقعات سے عبرت پکڑنی چاہیے اور اس سیلاب کو روکنے کی فکر کرنی چاہیے پیشتر اس کے کہ طوفان سر سے گزر کر پورے ملک کو تباہی کی لپیٹ میں لے لے۔ سیاسی آزادی بڑی پسندیدہ چیز ہے مگر اس حد تک کہ ملک اور قوم تباہ نہ ہو۔ اس آزادی کی آڑ میں اگر کچھ لوگ قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ آزادی کا تحفظ نہیں بلکہ قاتلوں کی پشت پناہی ہے۔ مشرقی پاکستان میں عام معافی کی وجہ سے پہلے ہی ظالموں کے حوصلے بڑھ چکے ہیں اور جن لوگوں کے گھر بار تباہ ہوئے ہیں (باقی صفحہ ۴۹ پر)

تفہیم القرآن

الاعلیٰ

نام | پہلی ہی آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کے لفظ الْاَعْلٰی کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مضمون سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، اور آیت نمبر ۶ کے یہ الفاظ بھی کہ "ہم تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے" یہ بتاتے ہیں کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نزولِ وحی کے وقت آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں اُس کے الفاظ بھول نہ جاؤں۔ اس آیت کے ساتھ اگر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ اور سورۂ قیامہ کی آیات ۱۶-۱۹ کو ملا کر دیکھا جائے، اور تینوں آیتوں کے اندازِ بیان اور موقع و محل پر بھی غور کیا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اِس سورہ میں حضورؐ کو اطمینان دلایا گیا کہ آپ فکر نہ کریں، ہم یہ کلام آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپ اِسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد، دوسرے موقع پر جب سورۂ قیامہ نازل ہو رہی تھی، حضورؐ بے اختیار الفاظِ وحی کو دُہرانے لگے۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ "اے نبی، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اِس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اِس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے"۔ آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقع پر حضورؐ کو ہم

بتقاضائے بشریت اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ ۱۳ ۔ ۱۴ آیتیں جو متواتر نازل ہوئی ہیں اِن میں سے کوئی چیز میرے حافظے سے نکل نہ جائے اور آپ اُن کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اِس پر فرمایا گیا" اور قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک تمہاری طرف اُس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے"۔ اس کے بعد پھر کبھی اِس کی نوبت نہیں آئی کہ حضورؐ کو ایسا کوئی خطرہ لاحق ہوتا، کیونکہ اِن تین مقامات کے سوا کوئی چوتھا مقام قرآن میں ایسا نہیں ہے جہاں اِس معاملہ کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہو۔

موضوع اور مضمون | اِس چھوٹی سی سُورۃ کے تین موضوع ہیں۔ توحید۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات۔ اور آخرت۔

پہلی آیت میں توحید کی تعلیم کو اِس ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کی جائے، یعنی اُس کو کسی ایسے نام سے یاد نہ کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کے نقص، عیب، کمزوری یا مخلوقات سے تشبیہ کا کوئی پہلو رکھتا ہو۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی فاسد عقائد پیدا ہوتے ہیں اُن سب کی جڑ اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی نہ کوئی غلط تصور ہے جس نے اُس ذاتِ پاک کے لیے کسی غلط نام کی شکل اختیار کی ہے۔ لہٰذا عقیدے کی تصحیح کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو صرف اُن اسماءِ حُسنیٰ ہی سے یاد کیا جائے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہیں۔

اِس کے بعد تین آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ تمہارا رب، جس کے نام کی تسبیح کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اُس کا تناسب قائم کیا، اُس کی تقدیر بنائی۔ اُسے وہ کام انجام دینے کی راہ بتائی جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے اور تم اپنی آنکھوں سے اُس کی قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ رہے ہو کہ وہ زمین پر نباتات کو پیدا بھی کرتا ہے اور پھر انہیں خس و خاشاک بھی بنا دیتا ہے۔ کوئی ہستی نہ بہار لانے پر قادر ہے نہ خزاں کو آنے سے روک سکتی ہے۔

پھر دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپ اِس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ قرآن جو آپ پر نازل کیا جا رہا ہے، یہ لفظ بلفظ آپ کو یاد کیسے رہے گا۔

اِس کو آپ کے حافظے میں محفوظ کر دینا ہمارا کام ہے، اور اس کا محفوظ رہنا آپ کے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے، ورنہ ہم چاہیں تو اِسے بُھلا دیں۔

اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے سپرد ہر ایک کو راہِ راست پر لے آنے کا کام نہیں کیا گیا ہے بلکہ آپ کا کام بس حق کی تبلیغ کر دینا ہے، اور تبلیغ کا سیدھا سادھا طریقہ یہ ہے کہ جو نصیحت سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہو اُسے نصیحت کی جائے اور جو اُس کے لیے تیار نہ ہو اُس کے پیچھے نہ پڑا جائے۔ جس کے دل میں گمراہی کے انجامِ بد کا خوف ہو گا وہ حق بات کو سُن کر قبول کرے گا اور جو بدبخت اسے سننے اور قبول کرنے سے گریز کرے گا وہ اپنا بُرا انجام خود دیکھ لے گا۔

آخر میں کلام کو اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ فلاح صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کریں، اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں ساری فکر بس اِسی دنیا کے آرام و آسائش اور فائدوں اور لذتوں کی ہے، حالانکہ اصل فکر آخرت کی ہونی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ یہ حقیقت صرف قرآن ہی میں نہیں بتائی جا رہی ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی انسان کو اِسی حقیقت سے آگاہ کیا گیا تھا۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

(اے نبیؐ) اپنے ربِّ برتر کے نام کی تسبیح کرو[1] جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا،[2] جس نے

---

[1] لفظی ترجمہ ہوگا "اپنے ربِّ برتر کے نام کو پاک کرو"۔ اِس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی مراد ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ کو اُن ناموں سے یاد کیا جائے جو اُس کے لائق ہیں اور ایسے نام اُس کی ذاتِ برتر کے لیے استعمال نہ کیے جائیں جو اپنے معنیٰ اور مفہوم کے لحاظ سے اس کے لیے موزوں نہیں ہیں، یا جن میں اُس کے لیے نقص یا گستاخی یا شرک کا کوئی پہلو نکلتا ہے، یا جن میں اُس کی ذات یا صفات یا افعال کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اِس غرض کے لیے محفوظ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو اس نے خود قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں، یا جو دوسری زبان میں اُن کا صحیح ترجمہ ہوں۔ (۲) اللہ کے لیے مخلوقات کے سے نام، یا مخلوقات کے لیے اللہ کے ناموں جیسے نام استعمال نہ کیے جائیں۔ اور اگر کچھ صفاتی نام ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ بندوں کے لیے بھی اُن کا استعمال جائز ہے، مثلاً رؤف، رحیم، کریم، سمیع، بصیر وغیرہ، تو ان میں یہ احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے کہ بندے کے لیے ان کا استعمال اُس طریقے پر نہ ہو جس طرح اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ (۳) اللہ کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جائے، کسی ایسے طریقے پر یا ایسی حالت میں نہ لیا جائے جو اس کے احترام کے منافی ہو، مثلاً ہنسی مذاق میں، یا بیت الخلاء میں یا کوئی گناہ کرتے ہوئے اس کا نام لینا، یا ایسے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کرنا جو اسے سن کر گستاخی پر اُتر آئیں، یا ایسی مجلسوں میں اُس کا نام لینا جہاں لوگ بیہودگیوں میں مشغول ہوں اور اس کا ذکر سُن کر مذاق میں اڑا دیں، یا ایسے موقع پر اس کا نام پاک زبان پر لانا جہاں اندیشہ ہو کر سُننے والا اسے ناگواری کے ساتھ سنے گا۔ امام مالکؒ کے حالات میں منقول ہے کہ جب کوئی سائل ان سے کچھ مانگتا اور وہ اس وقت اُسے کچھ نہ دے سکتے تو عام لوگوں کی طرح "اللہ دے گا" نہ کہتے بلکہ کسی اور طرح معذرت کر دیتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ سائل کو جب کچھ نہ دیا جائے اور اس سے معذرت کر دی جائے تو لامحالہ اسے ناگوار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر مَیں اللہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اسے ناگواری کے ساتھ سُنے۔

احادیث میں حضرت عقبہ بن عامر جُہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سجدہ میں

تقدیر بنائی[3] پھر راہ دکھائی،[4] جس نے نباتات اگائیں[5] پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا۔[6]

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی پڑھنے کا حکم اسی آیت کی بنا پر دیا تھا، اور رکوع میں سبحان ربّی العظیم پڑھنے کا جو طریقہ حضورؐ نے مقرر فرمایا تھا وہ سورۂ واقعہ کی آخری آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ پر مبنی تھا (مُسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حِبّان، حاکم، ابن المنذر)۔

[2] یعنی زمین سے آسمانوں تک کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اور جو چیز بھی پیدا کی اُسے بالکل راست اور درست بنایا، اس کا توازن اور تناسب ٹھیک ٹھیک قائم کیا، اُس کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ اُس جیسی چیز کے لیے اُس سے بہتر صورت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات ہے جو سُورۂ سجدہ میں یوں فرمائی گئی ہے کہ اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (آیت ۷) "جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی"۔ اِس طرح دنیا کی تمام اشیاء کا موزوں اور متناسب پیدا ہونا خود اِس امر کی صریح علامت ہے کہ کوئی صانعِ حکیم اِن سب کا خالق ہے۔ کسی اتفاقی حادثے سے، یا بہت سے خالقوں کے عمل سے، کائنات کے اِن بے شمار اجزاء کی تخلیق میں یہ سلیقہ، اور مجموعی طور پر اِن سب اجزاء کے اجتماع سے کائنات میں یہ حسن و جمال پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

[3] یعنی ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے یہ طے کر دیا کہ اسے دنیا میں کیا کام کرنا ہے اور اُس کام کے لیے اس کی مقدار کیا ہو، اُس کی شکل کیا ہو، اس کی صفات کیا ہوں، اس کا مقام کس جگہ ہو، اس کے لیے بقاء اور قیام اور فعل کے لیے کیا مواقع اور ذرائع فراہم کیے جائیں، کس وقت وہ وجود میں آئے، کب تک اپنے حصّے کا کام کرے اور کب کس طرح ختم ہو جائے۔ اِس پوری اسکیم کا مجموعی نام اُس کی "تقدیر" ہے، اور یہ تقدیر اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے لیے اور مجموعی طور پر پُوری کائنات کے لیے بنائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تخلیق کسی پیشگی منصوبے کے بغیر کچھ یونہی الل ٹپ نہیں ہو گئی ہے بلکہ اس کے لیے ایک پُورا منصوبہ خالق کے پیشِ نظر تھا اور سب کچھ اس منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الحِجر، حواشی ۱۳-۱۴۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۸۔ جلد پنجم، القمر، حاشیہ ۲۵۔ جلد ششم، عبس، حاشیہ ۱۲)

[4] یعنی کسی چیز کو بھی محض پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ جو چیز بھی جس کام کے لیے پیدا کی اُسے اُس کام کے انجام دینے کا طریقہ بتایا۔ بالفاظِ دیگر وہ محض خالق ہی نہیں ہے، ہادی بھی ہے۔ اُس نے یہ ذمّہ لیا ہے کہ جو چیز جس حیثیت میں اس نے پیدا کی ہے اس کو ویسی ہی ہدایت دے جس کے وہ لائق ہے اور اُسی طریقہ سے ہدایت دے جو اُس کے لیے موزوں ہے۔ ایک قسم کی ہدایت زمین اور چاند اور سُورج اور تاروں اور

ستاروں کے لیے ہے جس پر وہ سب چل رہے ہیں اور اپنے حصّے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک اور قسم کی ہدایت پانی اور ہوا اور روشنی اور جمادات و معدنیات کے لیے ہے جس کے مطابق وہ ٹھیک وہی خدمات بجا لا رہے ہیں جن کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت نباتات کے لیے ہے جس کی پیروی میں وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں نکالتے اور پھیلاتے ہیں، اس کی تہوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں، جہاں جہاں اللہ نے ان کے لیے غذا پیدا کی ہے وہاں سے اس کو حاصل کرتے ہیں، تنے، شاخیں، پتیاں، پھل پھول لاتے ہیں اور وہ کام پورا کرتے ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت خشکی، تری اور ہوا کے حیوانات کی بے شمار انواع اور ان کے ہر فرد کے لیے ہے جس کے حیرت انگیز مظاہر جانوروں کی زندگی اور ان کے کاموں میں علانیہ نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ ایک دہریہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مختلف قسم کے جانوروں کو کوئی ایسا الہامی علم حاصل ہے جو انسان کو اپنے حواس تو در کنار، اپنے آلات کے ذریعہ سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر انسان کے لیے دو الگ الگ نوعیتوں کی ہدایتیں ہیں جو اس کی دو الگ حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ایک وہ ہدایت جو اس کی حیوانی زندگی کے لیے ہے جس کی بدولت ہر بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینا سیکھ لیتا ہے، جس کے مطابق انسان کی آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ، پھیپھڑے، گردے، جگر، معدہ، آنتیں، اعصاب، رگیں اور شریانیں، سب اپنا اپنا کام کیے جا رہے ہیں بغیر اس کے کہ انسان کو اس کا شعور ہو یا اس کے ارادے کا ان اعضاء کے کاموں میں کوئی دخل ہو۔ یہی ہدایت ہے جس کے تحت انسان کے اندر بچپن، بلوغ، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کے وہ سب جسمانی اور ذہنی تغیرات ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس کے ارادے اور مرضی، بلکہ شعور کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ دوسری ہدایت انسان کی عقلی اور شعوری زندگی کے لیے ہے جس کی نوعیت غیر شعوری زندگی کی ہدایت سے قطعاً مختلف ہے، کیونکہ اس شعبۂ حیات میں انسان کی طرف ایک قسم کا اختیار منتقل کیا گیا ہے جس کے لیے ہدایت کا وہ طریقہ موزوں نہیں ہے جو بے اختیارانہ زندگی کے لیے موزوں ہے۔ انسان اس آخری قسم کی ہدایت سے منہ موڑنے کے لیے خواہ کتنی ہی حجت بازیاں کرے، لیکن یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے کہ جس خالق نے اس ساری کائنات میں ہر چیز کے لیے اس کی ساخت اور حیثیت کے مطابق ہدایت کا انتظام کیا ہے اس نے انسان کے لیے یہ تقدیر تو بنا دی ہوگی کہ وہ اس کی دنیا میں اپنے اختیار سے تصرفات کرے مگر اس کو یہ بتانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہوگا کہ اس اختیار کے استعمال کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کیا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن

ہم تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے[۸] سوائے اُس کے جو اللہ چاہے[۹]، وہ ظاہر کو بھی

جلد دوم، النحل، حواشی ۹-۱۰-۱۴-۵۶- جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۲۳- جلد پنجم، الرحمٰن، حواشی ۲-۳- جلد ششم، الدھر، حاشیہ ۵)

[۶] اصل میں لفظ مَرْعیٰ استعمال ہوا ہے جو جانوروں کے چارے کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن سیاقِ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اُگتی ہیں۔

[۷] یعنی وہ صرف بہار ہی لانے والا نہیں ہے، خزاں بھی لانے والا ہے۔ تمہاری آنکھیں اس کی قدرت کے دونوں کرشمے دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف وہ ایسی ہری بھری نباتات اُگاتا ہے جن کی تازگی و شادابی دیکھ کر دل خوش ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف اُسی نباتات کو وہ زرد، خشک اور سیاہ کر کے ایسا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلاب خس و خاشاک کی صورت میں بہائے جاتے ہیں۔ اس لیے کسی کو بھی یہاں اِس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ وہ دنیا میں صرف بہار ہی دیکھے گا، خزاں سے اس کو سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ یہی مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو سورۂ یونس، آیت ۲۴- سورۂ کہف، آیت ۴۵- سورۂ حدید، آیت ۲۰۔

[۸] حاکم نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے اور ابن مَرْدُوْیَہ نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو اس خوف سے دہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مجاہد اور کَلْبی کہتے ہیں کہ جبریل وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دہرانے لگتے تھے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا کہ وحی کے نزول کے وقت آپ خاموشی سے سنتے رہیں، ہم آپ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپ کو یاد ہو جائے گی، اِس بات کا کوئی اندیشہ آپ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپ بھول جائیں گے۔ یہ تیسرا موقع ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے دو مواقع سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۴، اور سورۂ قیامہ آیات ۱۶ تا ۱۹ میں گزر چکے ہیں۔ اِس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا اسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں، یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی

جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اُس کو بھی۔[۹]
اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں،[۱۰] لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔[۱۱]

لفظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو جائے۔

[۸] اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو دوسری جگہ قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے: وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (بنی اسرائیل، ۸۶) "اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعہ سے تمہیں عطا کیا ہے"۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اِس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اِس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اِس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبیؓ بن کعب نے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں، مَیں بھول گیا تھا۔

[۹] ویسے تو یہ الفاظ عام ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی۔ لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو قرآن کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جا رہے ہیں اِس کا بھی اللہ کو علم ہے، اور بھول جانے کے جس خوف کی بنا پر آپ ایسا کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ اس لیے آپ کو یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپ اسے بھولیں گے نہیں۔

[۱۰] عام طور پر مفسرین نے اِن دو فقروں کو الگ الگ سمجھا ہے۔ پہلے فقرے کا مطلب انہوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمہیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل کرنا سہل ہے، اور دوسرے فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرْ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے اور بعد کے فقرے کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مترتّب ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبی، ہم تبلیغ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ

جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کرے گا[۱۱]، اور اُس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا، پھر نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا[۱۲]۔
فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی[۱۳] اور اپنے رب کا نام یاد کیا[۱۴] پھر نماز پڑھی[۱۵]۔ مگر تم لوگ دنیا کی

تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ، بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لیے میسّر کیے دیتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغِ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اِس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، مگر اس سے تمہارا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے اُن لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہِ راست اختیار کر لیں۔ یہی لوگ تمہاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انہی کی تعلیم و تربیت پر تمہیں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجربے سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ یہ قریب قریب وہی مضمون ہے جو سورۂ عَبَس میں دوسرے طریقے سے یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ "جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے" (آیات ۵ تا ۱۲)۔

۱۱؎ یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجامِ بد کا اندیشہ ہوگا اُسی کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اُس بندے کی نصیحت کو توجہ سے سُنے گا جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق اور فلاح و سعادت کا راستہ بتا رہا ہو۔

۱۲؎ یعنی نہ اُسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے، اور نہ جینے کی طرح جیے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔ یہ سزا اُن لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول ہی نہ کریں اور مرتے دم تک کفر و شرک یا دہریت پر قائم رہیں۔ رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے بُرے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں موت دے دے گا، پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں پر لا کر ڈالی جائیں گی اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اور اس پانی سے وہ

زندگی کو ترجیح دیتے ہو^۱۶ حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے^۱۷۔ یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں^۱۸۔ ع

اِس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔ یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مُسلم میں حضرت ابوسعید خُدری اور بزّار میں حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے منقول ہوا ہے۔

^۱۳ پاکیزگی سے مُراد ہے کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، بُرے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور بُرے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا۔ فلاح سے مراد دنیوی خوشحالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیابی ہے، خواہ دنیا کی خوشحالی اس کے ساتھ میسّر ہو یا نہ ہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۳۔ جلد سوم، المومنون، حواشی ۱-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴)۔

^۱۴ یاد سے مراد دل میں بھی اللہ کو یاد کرنا ہے اور زبان سے بھی اُس کا ذکر کرنا ہے۔ دونوں چیزیں ذکرِ الٰہی کی تعریف میں آتی ہیں۔

^۱۵ یعنی صرف یاد کرکے رہ نہیں گیا بلکہ نماز کی پابندی اختیار کرکے اس نے ثابت کر دیا کہ جس خدا کو وہ اپنا خدا مان رہا ہے اس کی اطاعت کے لیے وہ عملاً تیار ہے اور اس کو ہمیشہ یاد کرتے رہنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ اِس آیت میں علی الترتیب دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے اللہ کو یاد کرنا، پھر نماز پڑھنا۔ اسی کے مطابق یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ اکبر کہہ کر نماز کی ابتدا کی جاتے۔ یہ منجملہ اُن شواہد کے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا ہے اس کے تمام اجزاء قرآنی اشارات پر مبنی ہیں۔ مگر اللہ کے رسول کے سوا اِن اشارات کو جمع کرکے کوئی شخص بھی نماز کی یہ ہیئت ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔

^۱۶ یعنی تم لوگوں کی ساری فکر بس دنیا اور اس کی راحت و آسائش اور اس کے فائدوں اور لذتوں کے لیے ہے۔ یہاں جو کچھ حاصل ہو جائے تم سمجھتے ہو کہ بس وہی اصل فائدہ ہے جو نہیں حاصل ہو گیا اور یہاں جس چیز سے محروم رہے تمہارا خیال ہے کہ بس وہی اصل نقصان ہے جو تمہیں پہنچ گیا۔

^۱۷ یعنی آخرت دو حیثیتوں سے دنیا کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔ ایک یہ کہ اس کی راحتیں اور لذتیں دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہیں، اور دوسرے یہ کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی۔

^۱۸ یہ دوسرا مقام ہے جہاں قرآن میں حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں کی تعلیم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نجم رکوع ۳ میں ایک حوالہ گزر چکا ہے۔

تفہیم القرآن

الغاشیہ

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الغاشیہ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | سورۃ کا پورا مضمون اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بھی ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب حضورؐ تبلیغِ عام شروع کر چکے تھے اور مکہ کے لوگ بالعموم اُسے سُن سُن کر نظر انداز کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس کے موضوع کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ زیادہ تر دو ہی باتیں لوگوں کے ذہن نشین کرنے پر مرکوز تھی۔ ایک توحید، دوسرے آخرت۔ اور اہلِ مکہ ان دونوں باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب اس سورہ کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کیجیے۔

اس میں سب سے پہلے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے اچانک اُن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ تمہیں اس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب سارے عالم پر چھا جانے والی ایک آفت نازل ہوگی؟ اس کے بعد فوراً ہی یہ تفصیل بیان کرنی شروع کر دی گئی ہے کہ اُس وقت سارے انسان دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر دو مختلف انجام دیکھیں گے۔ ایک وہ جو جہنم میں جائیں گے اور انہیں ایسے اور ایسے سخت عذاب جھیلنے ہوں گے۔ دوسرے وہ جو عالی مقام جنت میں جائیں گے اور اُن کو ایسی اور ایسی نعمتیں میسّر ہوں گی۔

اس طرح لوگوں کو چونکانے کے بعد یکلخت مضمون تبدیل ہوتا ہے اور سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ جو قرآن کی تعلیمِ توحید اور خبرِ آخرت کو سُن کر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں، اپنے

سامنے کی اُن چیزوں کو نہیں دیکھتے جن سے ہر وقت انہیں سابقہ پیش آتا ہے؟ عرب کے صحرا میں جن اونٹوں پر ان کی ساری زندگی کا انحصار ہے، کبھی یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ کیسے ٹھیک اُنہی خصوصیات کے مطابق بن گئے جیسی خصوصیات کے جانور کی ضرورت اِن کی صحرائی زندگی کے لیے تھی؟ اپنے سفروں میں جب یہ چلتے ہیں تو انہیں یا آسمان نظر آتا ہے، یا پہاڑ، یا زمین - انہی تین چیزوں پر یہ غور کریں۔ اوپر یہ آسمان کیسے چھا گیا؟ سامنے یہ پہاڑ کیسے کھڑے ہو گئے؟ نیچے یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ اگر یہ مانتے ہیں کہ ایک خالق نے بڑی حکمت اور بڑی قدرت کے ساتھ اِن چیزوں کو بنایا ہے، اور کوئی دوسرا اِن کی تخلیق میں شریک نہیں ہے، تو اُسی کو اکیلا رب ماننے سے انہیں کیوں انکار ہے؟ اور اگر یہ مانتے ہیں کہ وہ خدا یہ سب کچھ پیدا کرنے پر قادر تھا، تو آخر کس معقول دلیل سے اِنہیں یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہی خدا قیامت لانے پر بھی قادر ہے؟ انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے؟ جنت اور دوزخ بنانے پر بھی قادر ہے؟

اِس مختصر اور نہایت معقول استدلال سے بات سمجھانے کے بعد کفّار کی طرف سے رُخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا جاتا ہے اور آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، تم اِن پر جبّار بنا کر تو مسلط کیے نہیں گئے ہو کہ زبردستی اِن سے منوا کر ہی چھوڑو۔ تمہارا کام نصیحت کرنا ہے، سو تم نصیحت کیے جاؤ۔ آخر کار انہیں آنا ہمارے ہی پاس ہے۔ اُس وقت ہم اِن سے پورا پورا حساب لے لیں گے اور نہ ماننے والوں کو بھاری سزا دیں گے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کیا تمہیں اُس چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے؟[1] کچھ چہرے[2] اُس روز خوف زدہ ہونگے۔ سخت مشقت کر رہے ہونگے، تھکے جاتے ہونگے، شدید آگ میں جُھلس رہے ہونگے، کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا، خار دار سُوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لیے نہ ہو گا[3] جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے۔ کچھ چہرے اُس روز بارونق ہونگے، اپنی کارگزاری پر خوش ہونگے[4]

---

[1] مُراد ہے قیامت، یعنی وہ آفت جو سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اِس مقام پر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ یہاں بحیثیتِ مجموعی پُورے عالمِ آخرت کا ذکر ہو رہا ہے جو نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے سے شروع ہو کر تمام انسانوں کے دوبارہ اُٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزا و سزا پانے تک تمام مراحل پر حاوی ہے۔

[2] چہروں کا لفظ یہاں اشخاص کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ انسان کے جسم کی نمایاں ترین چیز اُس کا چہرہ ہے جس سے اس کی شخصیت پہچانی جاتی ہے، اور انسان پر اچھی یا بُری جو کیفیات بھی گزرتی ہیں ان کا اظہار اس کے چہرے سے ہی ہوتا ہے، اس لیے "کچھ لوگ" کہنے کے بجائے "کچھ چہرے" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

[3] قرآن مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے لوگوں کو زقّوم کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے لیے غِسلین (زخموں کے دھوون) کے سوا کوئی کھانا نہ ہو گا، اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ انہیں خار دار سوکھی گھاس کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا۔ ان بیانات میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیئے جائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زقّوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غِسلین ان کو ملے گا، اُس سے بھی بچنا چاہیں گے تو خار دار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے، غرض کوئی مرغوب غذا بہر حال انہیں نصیب نہ ہو گی۔

[4] یعنی دنیا میں جو سعی و عمل کر کے وہ آئے ہونگے اُس کے بہترین نتائج آخرت میں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ انہیں اطمینان ہو جائے گا کہ دنیا میں ایمان اور صلاح و تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے انہوں نے نفس اور اس کی خواہشات کی جو قربانیاں کیں، فرائض کو ادا کرنے میں جو تکلیفیں اٹھائیں، احکامِ الٰہی کی اطاعت میں جو

عالی مقام جنت میں ہونگے، کوئی بیہودہ بات وہاں وہ نہ سُنیں گے۔[۵] اُس میں چشمے رواں ہونگے اُس کے اندر اُونچی مسندیں ہوں گی، ساغر رکھے ہوئے ہونگے،[۶] گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔

(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟[۷]

زحمتیں برداشت کیں، معصیتوں سے بچنے کی کوشش میں جو نقصانات اٹھاتے اور جن فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کرلیا، یہ سب کچھ فی الواقع بڑے نفع کا سودا تھا۔

[۵] یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن مجید میں جگہ جگہ جنت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الطور، حاشیہ ۱۸۔ الواقعہ، حاشیہ ۱۳۔ جلد ششم: النباء، حاشیہ ۲۱)

[۶] یعنی ساغر بھرے ہوئے ہر وقت اُن کے سامنے موجود ہونگے۔ اس کی حاجت ہی نہ ہوگی کہ وہ طلب کرکے انہیں منگوائیں۔

[۷] یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے تو کیا خود اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ دیکھا اور کبھی نہ سوچا کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی اِن کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آسکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اس نے موجود پایا ہے ان کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے کہ ان کا وجود میں آنا تو ممکن ہے کیونکہ یہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں ان کے بارے میں وہ بے تکلف یہ فیصلہ کر دے کہ اُن کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اُس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آگیا۔ یہ اونٹ ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خصوصیات کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش لے کر آتے ہیں، جس کا سورج دن کو روشنی اور گرمی فراہم

اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ اِن پر جبر کرنے والے
نہیں ہو؂۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ اِن لوگوں
کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے، پھر اِن کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔ ع۱

کرتا ہے، اور جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی جس پر انسان رہتا اور بستا ہے جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پُوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جمے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اِس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اسے ماننا پڑیگا کہ ان میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دنیا کی اِن چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آئندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُن کو بعید از امکان سمجھا جائے۔

؂ یعنی اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ تمہارے سپرد یہ کام تو نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی منواؤ۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط راہ پر چلنے کے انجام سے خبردار کر دو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو۔

اسلامی نظامِ معیشت کی کامیابی کیلئے چند ناگزیر شرائط

شیخ یوسف القرضاوی

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

اسلامی نظامِ معیشت صرف اُسی وقت حسبِ منشا نتائج پیدا کر سکتا ہے جب ایک ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے جس میں نظامِ اسلام اور شریعتِ الٰہی زندگی کے اقتصادی، اجتماعی، سیاسی، اور ثقافتی شعبوں میں پوری طرح لاگو ہوں۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام اُس معاشرے میں معاشی مسئلے کو حل کرے جس میں غیروں کے نظامِ زندگی کی عملداری ہو۔ وہ نظامِ زندگی جو کچھ تو مشرق سے درآمد شدہ ہو اور کچھ مغرب سے۔ اور اُس میں اسلامی نظام کے کچھ اجزاء کی پیوندکاری کی گئی ہو تو یہ عدل و انصاف کے منافی اور غیر منطقی بات ہوگی۔

غربت کو دُور کرنے کے لیے اوّلین ہتھیار عمل ہے اور انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی کام کرے جس کے ذریعے وہ خود کفیل ہو سکے۔ مگر کیا کام سے وہ مطلوبہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اگر آدمی وہ کام کرے جسے وہ اچھی طرح نہ کر سکتا ہو یا اگر اچھی طرح کر سکتا ہو تو اُسے محنت کے مقابلے میں کم معاوضہ ملتا ہو یا ایسا ہو کہ معاوضہ تو اُسے پورا ملتا ہو مگر اُسے ایسے مواقع نہ ملتے ہوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قوتِ تخلیق کا اظہار کر کے ترقی کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محنت بھی کرتا ہو اور اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ایجاد و اختراع کا حق بھی ادا کرتا ہو۔ مگر اُسے اپنی محنت اور حسنِ عمل کے مطابق صلہ نہ ملتا ہو اور اُس کی حوصلہ افزائی نہ کی جاتی ہو۔ بلکہ اُسے انتقامی طور پر اور اُس سے حسد کرتے ہوئے اپنے جائز مقام سے بھی پیچھے دھکیل دیا جاتا ہو اور محض جانبداری سے کام لے کر یا اپنی من مانی کر کے اور بظاہر بڑوں اور ردل کے چھوٹوں کی خوشنودی کے لیے غیر مستحق شخص کو اس مقام پر فائز کر دیا جاتا ہو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کام کرنے والے کو اپنی محنت کا صلہ مناسب ہی ملتا ہو مگر جس معاشرے

میں وہ رہ رہا ہو اس کا طرزِ زندگی ہی ایسا ہو جو اُسے اِس بات پر مجبور کر دے کہ وہ اُن چیزوں پر اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کر دے جن میں معاشرے یا خود اس کے اپنے لیے کوئی فائدہ یا بہتری نہ ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تعیشات، گھٹیا عیش و نشاط، لذائذ جسمانی، لباس، دوستانہ تعلقات، سگریٹ، سینما، تھیٹر، رقص و سرود کی محفلوں وغیرہ جیسی مکروہ اور حرام چیزوں پر اتنا خرچ ہو جائے کہ فرد اور اس کے کنبہ کی حقیقی ضروریات کے لیے برائے نام ہی کچھ بچتا ہو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گمراہ اور کج رَو نہ ہو مگر جس معاشرے میں وہ زندگی بسر کر رہا ہو اس میں اجارہ داری (MONOPOLY)، سُود اور استحصال کا دَور دَورہ ہو اور ظلم و استبداد اور فتنہ و فساد کا سکہ چلتا ہو اور اُسے جو بھی چیز خریدنی ہو وہ بلیک مارکیٹ میں خریدنی پڑے، وہ کوئی کام رشوت کے بغیر نہ کروا سکتا ہو۔ اگر اُسے قرضے کی ضرورت پڑے تو بلا سُود کہیں سے ملتا نہ ہو۔

جب وہ جانی یا مالی طور پر کسی آفتِ ناگہانی سے دوچار ہو جائے اور قدرت و طاقت کے باوجود کام کرنے سے عاجز ہو جاتے یا اُس کا وہ سرمایہ ہی جاتا رہے جس سے وہ حلال روزی کما سکتا ہے اور پھر وہ قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔ اور غارمین (مقروض لوگوں) میں شمار ہونے لگے تو پھر وہ کیا کرے گا اور معاشرہ اس کے متعلق کیا موقف اختیار کرے گا؟

اِن حقائق کے پیشِ نظر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ غیر اسلامی معاشرے یا غیر اسلامی حکومت کے اندر کوئی شخص پوری طرح محنت مزدوری کر کے بھی خوشگوار زندگی کی ضمانت حاصل نہیں کر سکتا۔ جب اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا جس کی تنظیم اور نگرانی کا کام ایک اسلامی حکومت کے سپرد ہو گا اور پھر محنت اور محنت کاروں کے حالات ہی کچھ اور ہوں گے۔

۱۔ اسلامی حکومت لوگوں کو کام مہیا کرنے اور ہر کام کرنے والے کو اپنے مخصوص پیشے یا کام کی لازمی تربیت کا انتظام کرے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو سکے۔

۲۔ وہ ہر کاریگر کو اس کے مخصوص میدانِ کار میں رکھے گی تاکہ بہترین نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

۳۔ ہر کام کرنے والے کو وہ تمام آلات و اوزار مہیا کرے گی جو کم سے کم محنت اور وقت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار میں مدد دے سکیں۔

۴۔ اسلامی حکومت ہر کام کرنے والے کو اُس کی محنت اور ضرورت کے مطابق اُجرت کی ضمانت دیگی

خواہ یہ اُجرت کتنی بھی ہو۔ اسی طرح ہر کاریگر کو اپنی مصنوعات میں حقِ ملکیت کا موقع بھی فراہم کیا جائیگا اور وہ اپنے بعد اپنی اولاد کو اُن کا وارث بنا سکے گا۔

۵۔ جب کوئی کام کرنے والا اپنی اُجرت، منافع یا محنتانے سے اپنی اور اپنے اہلِ کنبہ کی ضروریات پُوری نہ کر سکے گا تو اس کی ضروریات کو پُورا کرنے کی ذمہ داری بیت المال پر ہوگی۔

۶۔ اگر وہ کسی آفتِ ناگہانی کے باعث قرض لینے پر مجبور ہو گیا تو وہ "غارمین" میں شمار ہوگا اور مالِ زکوٰۃ کا حق دار ہوگا۔

۷۔ یہ سب کچھ صرف اُسی وقت ہو سکے گا جب صحیح اسلامی طرزِ زندگی کو اپنایا جائے گا جس میں شراب و شاہد، رنگین شاموں، فضول لباس اور فساد و خرابی پیدا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ان چیزوں سے نسلِ انسانی ہلاکت و تباہی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اور افرادِ معاشرہ صحیح اور صالح زندگی کی ضروریات کے مقابلے میں کہیں زیادہ تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آج کے مسلم معاشرے میں نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ | فرض کیجیے آج کوئی معاشرہ جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتا ہے، نظامِ زکوٰۃ کو نافذ کرنا چاہتا ہے نتیجہ کیا ہوگا؟ میری رائے میں اس کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہوگا:-

۱۔ اتنی کم مقدار میں زکوٰۃ جمع ہوگی کہ وہ افلاس کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی ہوگی۔ اس کمی کے کئی اسباب ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل دو بڑے اہم ہیں:

اوّلاً: لوگ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے کترائیں گے۔ کیونکہ حکومت نے پہلے ہی بہت سے ناقابلِ برداشت قسم کے ٹیکس لگا رکھے ہیں۔ اور حکومتیں جو زکوٰۃ جمع کریں گی اور کتاب و سُنت کی عملداری کا اہتمام نہیں کریں گی اُن پر سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ چکا ہوگا۔ نیز انہیں یہ خیال ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم شریعت کی رُو سے جائز کاموں پر خرچ ہونے کے بجائے محض سیاسی مقاصد کے حصول پر صرف کی جائے گی جیسا کہ اکثر ٹیکسوں کی رقم کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد کی ایک کثیر تعداد دینی احکام کی پابندی قبول کرنے کے جذبے اور شعورِ اسلامی سے غیر اسلامی فکری یلغار کے باعث محروم ہو چکی ہے۔

ثانیاً: قومِ مسلم کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اُس کے پاس اتنی دولت یا آمدنی نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو سکے۔ اور یہ اثر ہے اُس طرزِ حیات کا جسے ــــ حاضر کے مسلمان اپنائے ہوتے ہیں۔ وہ طرزِ حیات ہے ان غیر ملکی کفار کا جن کی مسلمان اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ سانپ کے بل میں اُنگلی

ڈالیں گے تو یہ بھی ڈالیں گے۔ اور وہ طرزِ زندگی تعیشات، ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ناجائز اور حرام لہو و لعب میں فضول خرچی اور اسراف پر قائم ہے۔

۲- زکوٰۃ کی اس تھوڑی سی مقدار کا ایک حصہ انتظامی پیچیدگیوں اور ظاہری نمود و نمائش پر توجہ دینے کے باعث دفاترِ زکوٰۃ، سامانِ نوشت و خواند اور زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے لیے رکھے گئے ملازموں پر خرچ ہو جائے گا۔ یوں زکوٰۃ فقراء و مساکین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

۳- چونکہ حکام اور عوام کو اسلامی طرزِ زندگی کی کوئی تربیت نہیں دی گئی۔ اور ان کے قلب و ضمیر کو مسلمان نہیں کیا گیا، لہٰذا تقسیمِ زکوٰۃ کے وقت گڑبڑ اور دھاندلی ہو گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اکثر مستحقینِ زکوٰۃ تو زکوٰۃ سے محروم رہ جائیں گے اور غیر مستحق لوگ زکوٰۃ لے جائیں گے۔

۴- آخرکار نتیجہ یہ ہو گا کہ صرف زکوٰۃ سے معاشرے کے جملہ فقراء و مساکین کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہو سکیں گی بلکہ ان میں سے صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہی زکوٰۃ سے فائدہ اٹھا سکیں گے جنہیں تقسیمِ زکوٰۃ کے وقت کچھ رقم مل جائے گی۔ اِس کے بعد نظامِ زکوٰۃ کے بارے میں عام لوگ شکوہ و شکایت کرتے ہوئے اُس کی عدمِ افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اور یوں اسلام کے پورے نظامِ زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات کی راہیں کھل جائیں گی۔

مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام کے احکام و تعلیمات کے ساتھ دورِ حاضر کے کسی غیر اسلامی کافرانہ نظام کا جوڑ لگانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور کسی اخلاقی بیماری کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے معاشی مسائل تو اُسی وقت حل ہوں گے جب ہم اسلامی نظامِ حیات کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کے طور پر اپنائیں گے۔ اسلام افراد کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے فرد کو کام کرنے اور اپنی قوتِ اختراع و ایجاد سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر اُبھارتا ہے۔ ذاتی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ بعض حدود و قیود کا پابند کر کے اُس کی حفاظت بھی کرتا ہے تاکہ معاشرے میں ظلم و عدوان اور سرکشی و طغیان پنپنے نہ پائیں۔ وہ فرد کے لیے حقِ میراث مقرر کرتا ہے تاکہ وہ اپنے بعد اپنی اولاد کے بارے میں مطمئن رہے۔ یوں اسلام فرد کے لیے ترقی کا ایک وسیع دائرۂ کار مہیا کرتا ہے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا اظہار کر کے کسی فن میں کمال و تفوق حاصل کر سکتا ہے۔ دوسروں کو

فائدہ بھی پہنچا سکتا ہے اور اُن سے استفادہ بھی کر سکتا ہے۔ اور مال کی حیثیت اسلام کے نزدیک ایک نیک انسان کے ہاتھ میں صلاح و فلاح کے ایک ذریعہ کی ہے۔ اسلام یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ ساری مسلم سوسائٹی کی مجموعی دولت میں اضافہ و ترقی ہو اور وہ جملہ افرادِ معاشرہ کے لیے مفید ہو۔

اسلام فرد کو حقِ ملکیتِ ذاتی، کوئی کام کرنے اور اپنی قوتِ تخلیق و ایجاد کو بروئے کار لانے کی جو آزادی عطا کرتا ہے وہ یہ آزادی عطا کرتے وقت سرمایہ دارانہ نظام کی طرح سوسائٹی کے مفاد و مصلحت کو نظرانداز نہیں کرتا۔ بلکہ فرد اور سوسائٹی کے درمیان ایک منصفانہ توازن قائم کرتا ہے کہ فرد اور معاشرے دونوں کو اپنا اپنا حق ملتا رہے اور وہ بلا کم و کاست اپنے فرائض بجا لاتے رہیں۔

اسلامی نظام میں مال و دولت کا مالکِ حقیقی خدا تعالیٰ ہے اور عرفِ عام میں مال کا جو مالک ہوتا ہے وہ دراصل اس مال کا امانت دار ہوتا ہے جسے اس مال میں تصرف کی کھلی چھٹی نہیں بلکہ وہ اس کے خرچ کرنے میں مال کے مالکِ حقیقی کے احکام و ہدایات کا پابند ہے۔ یہ مالک وہ ہے جو سب بندوں خواہ وہ غریب ہوں یا امیر کا پروردگار ہے اور وہ ان پر اس سے بھی زیادہ مہربان ہے جتنی ایک ماں اپنے بچے پر ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ نظام جسے بندوں کے پروردگار نے مال کی حفاظت اس کو کسی کام میں لگانے، اس کی گردش و تقسیم اور اس کے خرچ و تصرف کے لیے بنایا ہے، سب افرادِ معاشرہ یعنی ساری قوم خواہ وہ غریب ہوں یا امیر کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہے۔

اس نظام نے مال کو ضائع کرنے اور اس کو بے جا خرچ کرنے سے روکا ہے اور فضول خرچی اور اسراف کو حرام کہا ہے اور فضول خرچوں کو شیطان کے بھائی بتایا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ قانون بنا دیا ہے کہ کسی نادان، فضول خرچ اور مال کو ضائع کر دینے والے کے حوالے کوئی مال نہ کیا جائے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء: ۵) "اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو"۔

اس نظام نے ایسی عیش و عشرت کی زندگی پر بھی قدغن لگائی ہے جو قوموں کو ناز و نعمت میں کھیلنے والی اقلیت اور دنیا کی نعمتوں سے محروم اور غم و حسد کی آگ میں جلنے والی اکثریت میں تقسیم کر دیتی ہے اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے ہدایت اور اصلاح کی راہ کا سنگِ گراں بن جاتے ہیں۔ جن کا دستور العمل یہ ہوتا ہے۔ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (ہدایت اور خیر و صلاح کا جو پیغام

اور پروگرام تم لے کر آئے ہو ہم اُس کے منکر ہیں) - اور اُن کی یہی عیش پرستی ساری قوم کے بگاڑ اور بالآخر تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔ (اسراء: ۱۶)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے۔ اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

عیش و تنعم کی زندگی گذارنے سے باز رکھنے کے اسی اصول کے تحت اسلام میں سونے چاندی کے برتن اور دیگر اسی طرح کی اشیاء رکھنے کو حرام کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں متکبر لوگوں کے گھروں میں عیش پرستی کی علامات ہوتی ہیں۔ اس طرح مردوں کے لیے سونے اور ریشم کا پہننا بھی اسلام میں حرام ہے۔

نظامِ اسلام میں احتکار اور سود بھی حرام ہیں۔ کیونکہ سرمایہ داری کا وجود نامسعود اپنی دو ٹانگوں پر کھڑا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اشیائے خوردونوش کو چالیس دن تک محض نفع اندوزی کی خاطر روکے رکھا اُس نے اللہ سے اپنی بیزاری اور اللہ نے اس سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیا۔"

قرآن مجید میں صاف طور پر یہ اعلان موجود ہے کہ سود خوار جب تک توبہ نہ کریں، اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف برسرِ جنگ تصور ہوں گے۔ اور اگر وہ توبہ کر لیں تو انہیں صرف اپنے اصلی مال ہی ملیں گے۔ نہ وہ کسی پر ظلم کریں گے اور نہ اُن پر ظلم کیا جائے گا۔ احتکار اور سود کا تو بلاشبہ یہ معنیٰ ہے کہ معاشرے کے دولتمند افراد غریبوں اور ناداروں کا خون چوستے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر امیر تر ہوتا جاتا ہے اور فقیر و غریب، غریب تر۔

اسلام نے روپے پیسے کو جمع کرنے اور اُسے بیکار پڑا رہنے دینے کی بھی بڑی شدت سے مذمت فرمائی ہے۔ اور ہر قسم کے نقد مال پر اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے، زکوٰۃ فرض کی ہے۔ خواہ اس مال کا مالک اُس سے نفع اندوز ہو یا نہ ہو۔ اس ترکیب سے مالداروں کو اس بات پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ ہر

جائز کاروبار اور تجارت میں اپنے مالوں کی سرمایہ کاری کریں۔ ایسا نہ ہو کہ مرورِ مہ و سال کے ساتھ ساتھ اُسے زکوٰۃ ہی ختم کر دے۔

اسلامی نظامِ زندگی میں لوگوں کے باہمی معاملات میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا فرض ہے۔ اسلام نے مالک اور ملازم، آجر اور اجیر، خریدار اور فروخت کنندہ اور مال پیدا کرنے والے (PRODUCER) اور صارف (CONSUMER) کے باہمی تعلقات کو نظم و ضبط کا پابند رکھنے کے لیے نہایت دُور رس اور منصفانہ قواعد و ضوابط وضع کیے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر حقدار اپنا حق لیتا ہے اور کوئی فرد یا گروہ کسی دوسرے فرد یا گروہ کے حقوق پامال کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

نظامِ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ قومی دولت کو بڑھانے اور اُسے غیر نفع بخش مصارف میں ضائع ہونے سے بچانے کو فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام قوم کی قوتوں اور دولت اور افرادِ قوم کی کوششوں کو شراب نوشی، لہو و لعب، رنگ و رامش اور دیگر ظاہری اور باطنی فواحش میں ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ جو قومی قوتیں اور دولت اُن فضول اور باعثِ فتنہ و فساد کاموں میں صرف ہوتی ہیں، اسلام اپنے قوانین و احکام کے ذریعے انہیں فسق و فجور اور فتنہ و فساد میں ضائع ہونے سے بچا کر اُن کا رُخ قومی پیداوار میں اضافہ کرنے کی طرف موڑ دیتا ہے۔

وہ قوم جو اپنے دن کا آغاز اس طرح کرتی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر وضو کر کے نماز ادا کرتی ہے اور وہ خوش مزاج اور چاق و چوبند ہوتی ہے، لامحالہ اس کی قومی پیداوار اس قوم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی جو اپنی نصف شب یا اس کا بیشتر حصہ فسق و فجور، شہوت پرستی اور لہو و لعب میں گزار کر جب صبح بادلِ ناخواستہ نیند سے بیدار ہوتی ہے اور اپنے کاموں پر جاتی ہے تو وہ بدمزاج کسل مند اور کم ہمت ہوتی ہے۔

اسلامی نظام اپنی فطرت و مزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اگر اُسے پورے طور پر نافذ کر دیا جائے تو جس معاشرے میں اُسے نافذ کیا جائے گا اس کی قومی دولت میں اضافہ ہوگا اور اس میں بیکار افراد اور فقراء کی تعداد نسبتاً کم ہوگی۔ اور جب کسی قوم میں فقراء کی تعداد کم ہو جائے قومی دولت میں اضافہ ہو اور اس کے مالدار لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرنے میں صحیح راہ اختیار کریں تو اُس میں معاشی

مسائل آسانی سے حل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ مسائل کبھی پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوں تو ایسی صورت اختیار نہیں کرتے کہ معاشرے کے لیے ایک مستقل خطرہ بن جائیں۔ جیسا کہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں ہو رہا ہے۔ وہاں بہت سے انقلابات آتے ہیں اور حق و ناحق تباہی و بربادی کا باعث ہوتے ہیں پھر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ظالمانہ نظاموں کی کوکھ سے ایسے نظام جنم لیتے ہیں جو ان نظاموں سے زیادہ ظالمانہ اور باعثِ فتنہ و فساد ہوتے ہیں۔ یہ ہیں نقاب پوش اور بے نقاب کمیونزم یا اشتمالیت کے نظام جو پرانے افلاس کا علاج نئے افلاس سے کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو وہ تبدیلی لاتے ہیں یہ ہے کہ وہ فقر و غربت کو ساری قوم پر یکساں طور پر ٹھونس دیتے ہیں، سوائے اُس چھوٹے سے گروہ کے جو ہیئتِ حاکمہ کے ارکان، فنکاروں (ARTISTS) اور ملک میں رائج نظام کے پشت پناہ ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے۔

اسلام افلاس کا تعاقب مختلف قوانین و احکام کے ذریعے کرتا ہے۔ اور غرباء کو مالدار بنانے کے لیے مختلف وسائل بروئے کار لاتا ہے۔ اگر اسلامی حکومت میں کچھ فقراء و غرباء رہ جائیں تو وہ کسی صورت میں ایک طبقہ نہیں قرار دیے جاتے جسے طبقۂ فقراء کہتے ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی شرط یہ ہے کہ وہ قانون اور روایات کی مدد سے نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہتی ہے۔ مگر اسلام کے قوانین اور مختلف ماحول میں اس کے ماننے والوں کی قائم کردہ روایات معاشرے کے کسی خاص گروہ پر فقر و غربت کو اس طرح ٹھونس نہیں دیتیں کہ بیٹے اور پوتے اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں پائیں۔ اسلامی سوسائٹی میں فقر و غربت کوئی دائمی اور مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی چشمِ ظاہر بیں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور بالآخر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ فقراء بھی تو آخر افراد ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو افراد آج فقیر ہوں کل غنی بن جائیں۔ کیونکہ اسلامی معاشرے میں منصفانہ مواقع اور جائز چیزوں کے حصول کی تمنا کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ ان یکونوا فقراء یغنیہم اللہ من فضلہٖ (سورۃ النور۔ ۳۲) "اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے امیر کر دے گا" اور سیجعل اللہ بعد عسرٍ یسراً (الطلاق: ۷) "اللہ تعالیٰ عنقریب بدحالی کے بعد خوشحالی کر دے گا"

اسلامی سوسائٹی میں افلاس کے سبب مفلس کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور نہ

اس کے حقوق پامال کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے اپنے افرادِ معاشرہ کو یہ تعلیم دی ہے جن میں خود فقراء بھی ہیں کہ معاشرے میں عزّت و احترام کا معیار دولت و ثروت اور دیگر منقولہ و غیر منقولہ جائیداد یا سیم و زر نہیں بلکہ علم و ایمان، تقویٰ اور اعمالِ صالح ہیں چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ — بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ (الحجرات : ۱۳)

ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؟ (الزمر : ۹) — کیا برابر ہیں جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ : ۱۱) — اللہ تعالیٰ تم میں سے اہلِ ایمان اور اہلِ علم کے درجات بلند کر دے گا۔

وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِیْٓئُ — اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ اور بدکار برابر نہیں

دَورِ جاہلیت کے عرب معاشرے میں افراد کی قدر و عزت کے پیمانے مال و دولت اور جاہ و حشمت تھے۔ جتنا کوئی شخص صاحبِ دولت و حشمت ہوتا تھا اتنا ہی وہ قابلِ قدر و عزّت ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اس سوسائٹی کے لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت پر سب سے پہلا جو اعتراض کیا تھا وہ یہی تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم فقیر و غریب ہیں۔ اور کہتے تھے کہ کاش اِ دحیِ الٰہی مکہ و طائف کے دو مشہور دولت مند ترین آدمیوں یعنی ولید بن مغیرہ قرشی اور عُروہ بن مسعوُد ثقفی میں سے کسی ایک پر نازل ہوتی۔ قرآنِ مجید کی سُورہ زُخرف میں ہے :

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۔ (زخرف : ۳۱) — اور وہ کہتے ہیں کیوں نہیں نازل کیا گیا یہ قرآن کسی آدمی پر جو اِن دونوں شہروں میں سے عظمت والا ہو۔

جب اسلام آیا تو اُس نے انسانی قدر و عزّت کے ان غلط پیمانوں کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور یہ واضح کیا کہ انسانیت کا حقیقی جوہر ایمان و عمل میں ہے نہ کہ گوشت پوست یا سیم و زر اور زیب و زینتِ ظاہری میں۔ چنانچہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں : بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پراگندہ

بال اور غبار آلود چہروں والے ہیں اور چیتھڑوں میں ملبوس ہیں کوئی انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا کہ اگر وہ مشیتِ ایزدی کے خلاف قسم کھالیں تو اللہ انہیں سچّا کر دکھائے۔ اس کے برعکس آپؐ یہ بھی فرماتے ہیں: قیامت کے روز ایک بڑا موٹا تازہ گرانڈیل آدمی آئے گا۔ مگر اللہ کے نزدیک اس کی وقعت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگی۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو کہ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ (سو ہم قیامت کے روز ان کے لیے وزن قائم نہیں کریں گے)۔

چونکہ لوگ نظری اصولوں کی نسبت عملی واقعات پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اس لیے ہم یہاں چند زندہ عملی مثالیں پیش کرتے ہیں جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں کہ اسلامی نظام نے غربت و افلاس پر کس طرح قابو پایا۔ اور آزادیٔ فکر و عمل اور عدل و انصاف کے تحت کس طرح خوش حالی اور امن و امان کا دَور دورہ ہُوا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس خوش حالی، امن و امان اور زندگی کی آسائشوں کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزے کے طور پر ان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحیِ الٰہی کے ذریعے اُس نظامِ زندگی کے مزاج و ماہیت سے اُمّت کو روشناس کرا دیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت، رحمت اور نعمت بنا کر آپؐ کے ذریعے بھیجا تھا۔ یہ نظامِ زندگی آج بھی بہترین نتائج و ثمرات پیدا کرسکتا ہے۔ اگر اسے اچھی طرح اور مکمل طور پر نافذ کیا جائے اور اس کے احکام و ہدایات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ اس نظامِ حیات کے نفاذ کے نتیجے کے طور پر دولت کی فراوانی، ہمہ گیر امن و امان، اور اجتماعی بہبود کا دَور دورہ ہوگا حتیٰ کہ جب اسلام کا نظامِ زندگی مستحکم طور پر قائم ہو جائے گا اور روئے زمین پر اس کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی تو افرادِ معاشرہ میں صدقہ و زکوٰۃ کا استحقاق رکھنے والا یا اُسے قبول کرنے والا کوئی نہیں ملے گا

صحیح بخاری میں عدی بن حاتم طائی سے روایت ہے کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آکر فاقہ کشی کی شکایت کی۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور راہ زنی کی شکایت کی۔ (چونکہ عدی اسلام قبول کرنے کے لیے رسولؐ اللہ کے پاس آئے ہوئے تھے اور رسولِؐ خدا کو یہ خدشہ ہُوا کہ کہیں وہ متزلزل اور دل برداشتہ نہ ہوجائے اس بات سے کہ اہلِ اسلام تو کمزور اور فقر و تنگدستی کا

شکار ہیں اور ان کے ملک میں امن و امان نہیں اس لیے آپؐ نے اُسے قبولِ اسلام کی ترغیب دلانے اور اپنے عزم و ارادہ میں ثابت قدم رکھنے کے لیے وہ ساری بشارتیں سنائیں جو حدیث میں مذکور ہیں، آپؐ نے فرمایا: "اے عدی! کیا تم نے حیرہ دیکھا ہے؟

اُس نے کہا: "میں نے دیکھا تو نہیں اس کے متعلق سنا ضرور ہے۔

آپؐ نے فرمایا: "اگر تم زیادہ دیر زندہ رہے تو تم دیکھو گے کہ ایک مسافر عورت حیرہ سے (تن تنہا) روانہ ہوگی اور کعبے کا طواف کرے گی اور اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل میں نہ ہوگا"۔ ایک روایت میں ہے کہ عنقریب ایک ایسا وقت آئے گا کہ اونٹ بغیر کسی محافظ کے مکہ کی طرف روانہ ہوگا"۔

حدیث کے راوی عدی کہتے ہیں کہ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ قبیلۂ طے کے وہ راہزن کہاں جائیں گے جنہوں نے سارے ملک میں فتنہ و فساد اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے (یعنی اپنے زمانے میں اُسے یہ بات کچھ انہونی سی معلوم ہوئی کہ اس حد تک امن و امان قائم ہو جائے گا کہ کوئی عورت اکیلی حیرہ سے مکہ جائے گی اور اُسے راستے میں کوئی لوٹنے گا نہیں۔ وہ صرف اپنے قبیلے کے فتنہ پردازوں اور راہزنوں کو جانتا تھا کہ جو بندگانِ خدا کو خوفزدہ کر کے فتنہ و فساد کا بازار گرم کرتے تھے)۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے اُس سے فرمایا: "اگر تم نے لمبی عمر پائی تو تم لوگ کسریٰ کے خزانوں پر قبضہ کرو گے۔

عدی نے کہا: "کسریٰ بن ہرمز؟

آپ نے فرمایا: "کسریٰ بن ہرمز۔ اور اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک آدمی اپنے مال و دولت سے ہاتھ بھر کر سونا چاندی نکالے گا اور کسی شخص کو تلاش کرے گا جو اُسے قبول کرے مگر اُسے قبول کرنے والا کوئی نہیں ملے گا"۔

حضرت عدی مسلمان ہو گئے۔ اور انہوں نے خود وہ سب کچھ دیکھا جس کی بشارت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ عدی فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ ایک عورت حیرہ سے کعبہ کا طواف کرنے کے لیے روانہ ہوتی ہے اور سوائے خدا کے کسی کا خوف اس کے دل میں نہیں۔ اور میں اُن لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانوں پر قبضہ کیا تھا۔ اگر تم لوگوں نے لمبی عمریں پائیں تو تم

ضرور اس فرمانِ نبویؐ یخرج مل ءکفه (کوئی شخص اپنے مال و دولت میں سے ہاتھ بھر صدقہ و زکوٰۃ نکالے گا) کی عملی صورت دیکھو گے۔ یعنی تم دیکھو گے کہ دولت کی ریل پیل اور فراوانی ہوگی اور فقراء بالکل نہیں ہوں گے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عدی بن حاتم سے یہ فرمانا کہ "اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک آدمی اپنے مال و دولت میں ہاتھ بھر سونا چاندی نکالے گا .... الخ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اتنے قریب کے زمانے میں ہونے والا ہے کہ صحابہ میں سے جن لوگوں کی زندگیاں لمبی ہونگی وہ اسے دیکھ سکیں گے۔ اور یہ سب کچھ خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت میں ہوا جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

ایسی احادیثِ نبوی بکثرت موجود ہیں جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اُمتِ مسلمہ میں دولت کی اتنی فراوانی ہو جائے گی کہ صدقہ و زکوٰۃ کے مستحق افراد کا طبقہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کی فراوانی اور غربت و افلاس کے انعدام کے بارے اُس رسولِ معصوم کا فرمان، جو اپنی خواہش کے تابع ہو کر کوئی بات نہیں کرتا، مسلمانوں کے اندر فقر و فاقہ کو ختم کرنے کے لیے جوش و جذبہ پیدا کرنے کا باعث ہے۔ اس کے برعکس تورات میں یہ لکھا ہے کہ فقر و فاقہ ابدی ہے اور روئے زمین سے فقراء ختم نہیں ہو سکتے (سفر التثنیہ ۱۵-۱۰-۱۱)۔

اب ہم ذیل میں کچھ ایسی احادیث پیش کرتے ہیں جو مسلم معاشرہ سے فقر و فاقہ کا نام و نشان مٹانے کا باعث ہوئیں۔

بخاری وغیرہ نے حارثہ بن وہب خزاعی سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ خیرات کر لو کیونکہ تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے کہ ایک شخص صدقہ ہاتھ میں لے کر گھومے پھرے گا مگر اُسے کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو صدقہ قبول کرلے بلکہ ہر شخص اُس صدقہ دینے والے کو یہی کہے گا۔ "اگر آپ کل آئے تو میں یہ صدقہ قبول کر لیتا۔ مگر آج مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں[1]"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

[1] عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۸۱

"قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تم میں مال و دولت اتنی فراوانی نہ ہو جائے کہ صاحبِ مال و دولت کسی ایسے شخص کے پاس جاتے جو اُس سے صدقہ قبول کرے اور وہ اُسے اپنے مال میں سے صدقہ و زکوٰۃ پیش کرے تو جس شخص کو پیش کرے وہ اُس سے کہے "مجھے اس کی کوئی ضرورت و خواہش نہیں[1]"

حضرت ابو موسےٰ اشعری سے بھی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ کوئی شخص اپنے سونے وغیرہ کی زکوٰۃ لے کر گھومے پھرے گا مگر اُسے کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مسلمانوں کے پاس اتنی دولت آگئی کہ سارے معاشرے میں کوئی صدقہ و زکوٰۃ کا مستحق نہیں ملتا تھا۔ مگر یہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں کو ایک مستحکم حکومت عادل حکمران اور خلافتِ راشدہ میسر آگئی تھی۔ اور یہ سب چیزیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع تھیں۔

امام بیہقی نے الدلائل میں عمر بن اسید بن عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز صرف تیس ماہ (ڈھائی سال) مسلمانوں کے حکمران رہے۔ بخدا ! اُن کے عہد میں کوئی شخص بہت سا مال لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ اسے فرماتے کہ فقراء و مساکین میں جہاں اس کا مصرف دیکھو اس مال کو دے ڈالو۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ شخص اپنا مال لے کر لوٹ آتا اور کہتا کہ اس مال کو لینے والا مجھے کوئی نہیں ملتا کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مالدار کر دیا ہے"

امام بیہقی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اُس حدیث کی تصدیق کرتی ہے جو ہم نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے[2]

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں "مجھے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے افریقی علاقوں سے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ میں نے صدقات وصول کرنے کے بعد اُن علاقوں کے فقراء کو بلایا تاکہ اُن میں وہ صدقات بانٹ دوں۔ مگر مجھے کوئی فقیر اُن علاقوں میں نہ ملا۔ اور نہ

---

[1] عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۸۱ - [2] عمدۃ القاری ج ۱۶ ص ۱۳۵

مجھے اپنے علاقے میں کوئی ایسا شخص نہ ملا جو صدقہ و زکوٰۃ لے لے۔ کیونکہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ چنانچہ میں نے صدقات کی اس رقم سے کچھ قیدی خرید کر آزاد کر دیئے۔[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت سے پہلے بھی ایک ایسا دور گزرا ہے یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت جبکہ بعض علاقے جو اسلام اور عدل و انصاف کی حکمرانی سے سرفراز تھے، انہیں اس دولت سے بہرہ وافر ملا ہوا تھا جس کی خیر و برکت سے سارے اہلِ علاقہ متمتع ہو رہے تھے۔ چنانچہ یمن کے علاقے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادے معاذ بن جبل اور اُن اشخاص کو جنہیں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اُن کی جگہ مقرر کیا تھا، کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو اُن سے زکوٰۃ لے لے۔ اس صورتِ حال سے مجبور ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دارالخلافت اور اسلامی دارالحکومت مدینہ کو ساری زکوٰۃ بھیج دی تھی۔

آیئے دیکھیں کہ ابو عُبید مصنّف کتاب الاموال حضرت معاذ والی اِس روایت کو کس طرح بیان کرتا ہے۔ ابو عبید کتاب الاموال میں رقم طراز ہیں:

جب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو وہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات تک لشکر کے ساتھ رہے۔ پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے انہیں واپس بھیج دیا۔ حضرت معاذ نے اہلِ یمن سے صدقات وصول کر کے اُن کا ایک تہائی حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین کو بھیجا۔ آپ نے وہ لینے سے انکار کر دیا اور انہیں کہلا بھیجا کہ "میں نے تمہیں صرف صدقات و جزیہ وغیرہ جمع کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ میں نے تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم دولتمند لوگوں سے صدقات وغیرہ لے کر انہیں غرباء و فقراء میں تقسیم کر دو۔" حضرت معاذؓ نے جواب دیا "میں نے آپ کو کوئی چیز اس حال میں نہیں بھیجی کہ یہاں مجھے کوئی اس کا لینے والا مل رہا ہو۔" پھر جب دوسرا سال آیا تو حضرت معاذؓ نے اہلِ یمن کے کل صدقے کا نصف حضرت عمرؓ کو بھیجا۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ کے درمیان پھر وہی ماجرا ہوا جو پہلے سال ہوا تھا۔ اس کے بعد جب تیسرا سال آیا تو حضرت معاذؓ نے کل صدقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ انہوں نے

---

[1] سیرۃ عمر بن عبدالعزیز از ابن عبدالحکم صفحہ ۵۹

پھر اُسی طرح واپس بھیج دیا جس طرح اس سے پہلے بھیج دیا تھا اور وہی کہلا بھیجا جو پہلے کہلا بھیجا تھا۔ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "مجھے یہاں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں مل سکا جو مجھ سے زکوٰۃ وغیرہ لے لے"۔

اللہ اللہ! یہ حدیث کتنی عظیم اور عمدہ ہے۔ یہ حدیث جسے ہم کتابوں میں پڑھ کر گزر جاتے ہیں اور اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کے عدلِ اجتماعی نے چند سالوں میں مسلمانوں کو دولت مندی، معاشی کفالت اور استحکام کی صورت میں وہ ثمرات دیتے ہیں جو مذکورہ حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ کیا دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود ہے؟ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے چشمِ فلک نے کوئی ایسا حکمران دیکھا ہے جو اپنے گورنر کو اس بات سے منع کر دے کہ وہ مختلف علاقوں سے مال و دولت جمع کر کے دارالحکومت میں بھیجے اور اس سے کہے کہ میں نے تمہیں اس لیے گورنر بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ تم اپنے علاقوں سے ٹیکس اور دیگر ظالمانہ محصول وغیرہ وصول کر کے مجھے بھیجو جیسا کہ بادشاہ لوگ کرتے ہیں۔ اگر فقیہ صحابی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ کو اس بات کا یقین نہ دلا دیتے کہ اُن کے علاقے میں معاشی عدل و انصاف کا دَور دورہ ہے اور یہ کہ وہ کوئی شے انہیں اس حالت میں نہیں بھیج رہے کہ اُن کے علاقے میں اُس کا کوئی ضرورت مند ہو، تو وہ اس علاقے کے دولتمندوں سے مال لے کر وہاں کے فقراء کو دینے کا پورا اہتمام کرتے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حضرت معاذ بن جبل اپنے علاقے کے غرباء کی ضروریات کو نظر انداز کر کے زکوٰۃ و صدقات امیرالمومنین کو بھیج دیتے، حالانکہ وہ خود ہی تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجتے وقت فرمایا تھا: "وہاں کے دولتمندوں سے مال لے کر فقراء و مساکین میں تقسیم کر دو"۔

تمام علاقوں کے مسلمان ایک امت ہیں۔ لہٰذا جب کسی خاص علاقے کے باشندے زکوٰۃ و صدقات سے بے نیاز ہو جائیں اور وہاں کے دولتمندوں کے مالوں کی زکوٰۃ سے غرباء کی ضروریات پوری ہونے کے بعد کچھ بچ جائے تو اُس سے کسی دوسرے علاقے کے غرباء کی ضروریات پوری کرنا فرض ہے یا مسلمانوں کی مرکزی حکومت کو چاہیے کہ وہ اُس ضرورت سے زاید زکوٰۃ کو ایسے کاموں پر خرچ کر دے جن میں مسلمانوں کے لیے اجتماعی اور دینی اعتبار سے خیر و صلاح ہو۔

جب اور جہاں اسلامی نظامِ حیات کو نافذ کیے جانے کا موقع ملا تو اس نے وہ نتائج اور ثمرات

پیدا کیے جو اُوپر بیان کیے گئے ہیں۔ اور یہ جو مسلمان قوم بدقسمتی سے اِس عدیم المثال نظامِ زندگی کی برکات سے محروم ہوگئی ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ ظالم لوگ زبردستی اس پر مسلّط ہو گئے ہیں۔ اور مال و دولت پر بیوقوفوں اور عقل کے اندھوں کا قبضہ ہے اور دین میں جہالت اور بدعت نے فساد اور بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔

عالمِ واقعات سے پیش کردہ ان مثالوں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو فقر و غربت کو ایک مرضِ لادوا اور بلائے بے درماں سمجھتے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی سراسر غلطی پر ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام میں نظامِ زکوٰۃ کا نبایا جانا اسلامی معاشرے میں فقراور اور فقراء کے وجود کی ضرورت کا "سرکاری طور پر اعتراف" ہے۔

مسلم معاشرے میں فقر و غربت کا وجود کوئی مطلق اور حتمی امر نہیں بلکہ بالکل ہنگامی اور وقتی بات ہے جس سے مسلم معاشرے کی طرح غیر مسلم معاشرے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے لازمی قوانین و اصول وضع کیے جائیں۔ اسلام کا نظامِ زکوٰۃ بھی اِسی قسم کے قوانین پر مشتمل ہے۔

آج بھی اگر اسلامی نظامِ زندگی کو کسی معاشرے میں پُوری طرح نفاذ کا موقع دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ فقر و غربت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے اور دولت و ثروت کے چشمے پھُوٹ پڑیں اور لوگ امن و اطمینان کی زندگی گزارنے لگیں۔ اور غربت و افلاس اور احتیاج و مسکنت اور بھُوک اور خوف بالکل کافور ہو جائیں اور ہر شخص کو با فراغت روزی ملنے لگے۔ حتیٰ کہ جب اُس سوسائٹی میں پیداوار بڑھنے لگے گی اور اسلام کے نظامِ عدل و انصاف کے تحت دولت اور حصولِ دولت کے ذرائع کی منصفانہ تقسیم ہو گی تو سارے معاشرے میں کوئی زکوٰۃ کا مستحق فقیر نہیں ملے گا۔ اور زکوٰۃ دوسرے مصارف تالیفِ قلوب قیدیوں، قرض داروں، راہِ خدا میں نکلنے والوں اور مسافروں پر خرچ کی جانے لگے گی۔

عالم اسلام

مصر کا تازہ انقلاب اور اُس کے اندرونی حقائق

(۲)

از جناب خلیل حامدی صاحب

الغرض علی صبری اور شعراوی جمعہ اور شامی شرف اور اِس مضبوط دھڑے کے دوسرے افراد نے جمال عبدالناصر کے زیرِ سایہ اپنے پنجے مصر کے اندر اس قدر گہرے گاڑ رکھے تھے کہ اُسے مسندِ اقتدار سے اُتارنا بہت دشوار تھا۔ ۱۵ مئی ۱۹۷۱ء سے پہلے یہ گروپ اِس نشے میں تھا کہ وہ جب چاہے گا سادات کو اٹھا کر پھینک دے گا۔ سوشلسٹ یونین اِس کی جیب میں تھی، خفیہ تنظیم اس کی خدمت پر مامور تھی، خفیہ پولیس اس کی باندی تھی۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر اس کا قبضہ تھا، اخبارات میں اس کے ایجنٹوں اور با تنخواہ ملازموں کی کھیپ کی کھیپ کام کر رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وزیرِ جنگ محمد فوزی اس گروہ کا سرخیل تھا اور اس کی بدولت اسے فوج کی پشت پناہی کا زعم بھی تھا۔ اس گروپ نے یکایک اپنے استعفے پیش کر دیئے اور اپنے زیرِ تصرّف وسائل کے ذریعہ اپنے حق میں ہنگاموں کا ایک طوفان رستاخیز برپا کرنا چاہا اور تقریباً وہی حالات پیدا کرنے چاہے جو ۹ جون ۱۹۶۷ء کو عبدالناصر کے صدارت سے استعفیٰ دینے کے موقع پر رونما ہوتے تھے۔ عبدالناصر نے اِدھر استعفیٰ دیا اور اُدھر اس گروپ نے اپنے مذکورہ بالا برق رفتار وسائل کی بدولت یکایک مظاہرے برپا کروا دیئے اور ناصر کو استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ یہ گروپ ابھی چاہتا تھا کہ ناصر برسرِ اقتدار رہے اور اُس کی آڑ میں یہ اپنا مستقبل تعمیر کرتے رہیں۔ ناصر کے بعد یہ گروپ برابر انور السادات سے گلوخلاصی کرانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچتا رہا۔ مگر ان کی تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ سادات نے معجزانہ طور پر اس گروپ کو ۱۵ مئی ۱۹۷۱ء کو پچھاڑ دیا اور یہ لوگ سادات سے نجات پانے کے بجائے ابی زعبل کی جیل میں پہنچ گئے۔ اب اُن پر کھلی عدالتوں میں مقدمات چلائے جا رہے ہیں اور وہ تمام مظالم منظرِ عام پر آ رہے ہیں جو ۱۹ سال تک مصری عوام بھگتتے رہے ہیں، جن کا زیادہ تر نشانہ اخوان المسلمون کی جماعت اور دوسرے

وہ تمام خفیہ رپورٹیں، فائلیں اور ٹیپیں نذرِ آتش کر دی گئی ہیں جو پولیس اسٹیٹ نے جمع کر رکھی تھیں اس کے ساتھ ہی ساوات نے ملک کے لیے مستقل دستور تیار کرنے کا کام شروع کر دیا۔

اس دستور کا مسودہ تیار کیا جا چکا ہے نیشنل اسمبلی کے ارکان میں سے ۸۰ افراد پر مشتمل ایک دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے پہلے ہی اجلاس میں یہ طے کیا کہ کمیٹی دستوری خاکہ تیار کرنے سے پہلے وسیع پیمانے پر ملک کے اہلِ علم و رائے، ماہرینِ دستور اور عوام کے تمام طبقوں سے رائے معلوم کرے گی۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد کمیٹی نے متعدد ذیلی گروپ تشکیل دیئے۔ اور انہوں نے مختلف شہروں اور علاقوں کا دورہ کیا، عوامی اجتماعات منعقد کیے اور دستوری مسائل کے بارے میں عوام کے رجحانات معلوم کیے۔ نیز یونیورسٹیوں کے اساتذہ، ماہرینِ دستور، علمائے دین، ادباء اور اہلِ قلم کے ساتھ بھی مجالسِ مذاکرہ منعقد کی گئیں اور تقریر و تحریر کے ذریعے سے اُن کے خیالات معلوم کیے گئے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس مسئلے میں مصری عوام کی صحیح اور حقیقی خواہش پوری طرح سامنے آجائے۔ چنانچہ دستور ساز کمیٹی کی طرف سے عوامی خواہشوں پر مشتمل جو رپورٹ پیش کی گئی ہے اُس کی رُو سے دستور کے بارے میں مصری عوام نے یہ مطالبات کیے ہیں:

۱۔ ریاست کا نام عرب ری پبلک آف مصر ہو۔ ریاست کا مذہب اسلام ہو، اس کے قوانین کا ماخذ اسلامی شریعت ہو اور اس کی سرکاری زبان عربی ہو۔ ریاست تین اداروں پر مشتمل ہو۔ ایک مقننہ جو منتخب اسمبلی پر مشتمل ہو۔ دوسرا عدلیہ جو ہر لحاظ سے آزاد ہو۔ اور تیسرا انتظامیہ جو صدر جمہوریہ کے تحت ہو۔

۲۔ صدر اور نائب صدر کا انتخاب ایک ہی وقت میں ہو (جیسا کہ امریکہ میں کیا جاتا ہے) اور دونوں عہدوں کے لیے ایک سے زائد امیدوار کھڑے ہوں تاکہ عوام کو بہتر شخص کے انتخاب میں سہولت ہو۔ عہدۂ صدارت کی مدت پانچ سال ہو۔ اور ایک مرتبہ جو شخص صدر منتخب ہو جائے دوبارہ اُسے از رُوئے دستور صدارت کا امیدوار کھڑا ہونے کی اجازت نہ ہو۔

۳۔ عوام اختیارات کا سرچشمہ ہوں، نیشنل اسمبلی کی رکنیت کے لیے ہر باشندہ امیدوار کھڑا ہو سکتا ہو اور ہر شخص کو انتخاب کا حق حاصل ہو۔ (یعنی سیاسی پابندیوں اور ترجیحی سلوک کا نظام ختم کیا جائے) نیشنل اسمبلی کی رکنیت کے لیے سوشلسٹ یونین کا رکن ہونا ضروری نہ ہو۔ نیشنل اسمبلی کی

رکنیت کو اسمبلی ہی کی قرارداد سے ختم کیا جا سکے۔ اگر نیشنل اسمبلی کے کسی رکن کی رکنیت منسوخ ہو جائے تو اگر وہ سوشلسٹ یونین کا رکن بھی ہے تو اس کی رکنیت پر کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔ نیشنل اسمبلی اپنے اختیارات کسی فرد کو تفویض نہیں کر سکتی اور نہ اپنے اختیارات سے دستبردار ہو سکتی ہے۔

۴۔ عدلیہ کلیتہً آزاد ہوگی۔ اور "ہنگامی عدالت" کے قیام کی اجازت نہیں ہوگی۔ کوئی شہری عدالتی حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ تمام عدالتوں کو یہ حق ہوگا کہ وہ یہ نظر رکھیں کہ آیا قوانین دستوری تقاضوں کے مطابق ہیں۔ نیز اگر انتظامی حکام اپنے اختیارات کو غلط استعمال کر رہے ہوں تو عدالتوں کو ان کے محاکمہ کا حق ہوگا۔ پرسنل لا اور لیبر لا میں عدالتی ٹریبونل کا نظام اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ سوشلسٹ یونین محض ایک تنظیم ہوگی (حکمران ادارہ نہیں ہوگا) اور براہِ راست اختیارات رکھنے کے بجائے نیشنل اسمبلی کے ذریعہ اپنے اختیارات کا استعمال کرے گی۔ یونین کا قانون استصواب عام کے لیے پیش کیا جائے گا۔ یونین کے تمام ماتحت ادارے علانیہ اور کھلے کھلے ہوں گے۔ اس کا کوئی شعبہ خفیہ نہیں رکھا جائے گا۔

مصری عوام نے جن میں پیش پیش یونیورسٹیوں کے اساتذہ، قانون دان، علماء و فقہاء، صحافی اور ادباء ہیں، لبشدت یہ مطالبہ کیا ہے کہ نئے دستور کے اندر واضح طور پر یہ ضمانت دی جائے کہ نہ صرف شخصی آزادیاں محفوظ و مامون ہوں گی بلکہ کسی ادارے کی طرف سے ان پر دست درازی کی گنجائش نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں ان تمام حلقوں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر ذیل کی باتوں پر خاص طور پر زور دیا ہے:

۱۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن عوام کی دسترس میں ہوں تاکہ ان کے ذریعہ ہر فرد اور گروہ ضرورت کے وقت اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکے اور اسے عوام تک پہنچا سکے۔

۲۔ اٹارنی جنرل کا عہدہ بحال کیا جائے تاکہ جس شکل میں بھی آزادیوں پر دست درازی ہو اس کا تعاقب کیا جائے اور اس کے خلاف دستوری ضمانت کو حرکت میں لایا جائے۔

۳۔ عدالتوں کو (جن میں عدالتِ عالیہ سرفہرست ہے) یہ حق حاصل ہو کہ وہ انفرادی آزادیوں کی حفاظت کر سکیں اور ان آزادیوں پر حملہ آور ہونے والے شخص، یا ادارہ کی بروقت سرکوبی کر سکیں۔

۴۔ دستوری آزادیوں کو جو فرد سلب کرنے کی کوشش کرے اسے فوجداری قانون کے تحت سزا دی جائے۔

۵۔ اعلیٰ عدالت کو یہ خصوصی اختیار حاصل ہو بلکہ یہ اعلیٰ عدالت کا اصل فریضہ ہو کہ دستور کے اندر جو آزادیاں دی جائیں اور شہریوں کو جو حقوق دیے جائیں ملکی قوانین کے ذریعہ ان سے کھیلنے کی کسی کو اجازت نہ دے۔

جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے سادات کی حکومت نے اس سے دستبرداری کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ اپنی تقریروں کے اندر اس بات کا بار بار اظہار کیا ہے کہ مصر اشتراکیت کے راستے سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ دستور کے جو بنیادی خدوخال سادات نے تجویز کیے ہیں ان میں بھی واشگاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ دستوری ڈھانچہ اشتراکی تصور سے الگ نہیں ہو گا۔ جب دستور ساز کمیٹی نے مصری عوام سے اشتراکیت کے بارے میں دریافت کیا تو یہ سوال نہیں کیا کہ کیا تم اشتراکیت چاہتے ہو یا نہیں بلکہ یہ سوال کیا کہ تم کیسی اشتراکیت چاہتے ہو۔ چنانچہ اس سوال کے جو جوابات ملے ہیں وہ ملاحظہ ہوں۔

استاذ سلیمان الطماوی جو عین شمس یونیورسٹی میں دستوری قانون کا پروفیسر اور لاء ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہے، اُس کمیٹی کا صدر ہے جسے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں اشتراکیت کے بارے میں عوام کے تمام جوابات کا خلاصہ یہ بیان کیا ہے:

"دستور میں صرف اشتراکی عقیدہ کا اعلان کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ دستور میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ اشتراکی عقیدہ کے ستون کیا ہوں گے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اشتراکیت ہماری اقدار اور ہمارے نظریات ہی سے ماخوذ ہو گی"

اسی کمیٹی کے ایک اور رکن استاذ علی سید منصور نے زیادہ صراحت سے اس بات کو بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:

"تمام علمائے اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ دستور میں قطعی نص سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اسلام ریاست کا دین ہو گا، شریعت اسلامی ہمارے بنیادی قوانین کا سرچشمہ ہو گی، اور ہماری اشتراکیت اسلام ہو گی، اور ہمارا اقتصادی نظام صحت مندانہ بنیادوں پر استوار ہو گا اور استحصال اور سود سے پاک ہو گا، اور جو نظریات اباحیت کے داعی ہیں یا ہماری مذہبی اور اخلاقی اقدار کو پامال کرتے ہیں ان پر قدغن عائد کی جائے گی"[1]

[1] معذنامہ الحیات (بیروت) ۱۳ جون ۱۹۷۱ء

ہم نے دستور ساز کمیٹی کی جمع کردہ عوامی آراء کے بعض حصے بیان کر دیتے ہیں۔ دستور ساز کمیٹی نے رپورٹ میں بتایا ہے کہ اُسے دس ہزار سے زائد دستوری تجاویز اور سفارشات موصول ہوئی ہیں جن میں قریب قریب ایک ہی ذہن کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

سادات کے مسلسل اعلانات کے بعد کہ وہ مصر میں قانون کی حکومت قائم کریں گے، جمہوریت کو فروغ دیں گے اور قومی اتحاد کو بروئے کار لائیں گے، مصر کے ہر طبقے کے اندر زندگی کی رَو دوڑ گئی۔

انور السادات کے اعلانات تو بڑے خوش آئند تھے اور اُن کے متعدد اقدامات بھی بنیادی تبدیلی کے حامل ہیں۔ مصری قوم کے لیے اگر کوئی اور خوشی نہ بھی ہو تو یہی کافی ہے کہ جبر و تشدد کے نظام سے اُسے نجات مل گئی ہے اور ۱۸ سال کے بعد پہلی مرتبہ خوف و ہراس کے بھیانک سائے اُس کے سر سے ٹلے ہیں اور بھائی کے خلاف بھائی کی جاسوسی اور باپ کے خلاف بیٹے کی جاسوسی کا دَور ختم ہو گیا ہے اور مردہ قوم کے اندر زندگی کے آثار ہویدا ہو گئے ہیں۔ لیکن اب حالیہ بعض ایسے اعلانات سامنے آ رہے ہیں جو اس خوشی کو منغص کر رہے ہیں۔ مثلاً انور السادات نے ۱۰ جون ۱۹۷۱ء کو ایک ایسا حکمنامہ جاری کیا ہے جس کی کوئی قانونی سند نہیں ہے۔ اس حکم کی رُو سے انھوں نے مصر کے متعدد طبقوں کو سیاسی اور شہری حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ حکمنامہ میں ان طبقوں کو رجعت پسند کہا گیا ہے اور انہیں شہری اور سیاسی حقوق سے محروم کر دینے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے عبدالناصر کے اختیار کردہ راستے کے خلاف اپنا راستہ تجویز کیا تھا، اور مصری انقلاب نے اپنے ترقیاتی اَدوار میں انہیں اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ یہ اشتراکیت کے دشمن ہیں اور اشتراکی انقلاب کے راستے کا روڑا ہیں، اور خود ساختہ حقوق کے دعویدار ہیں، اور عوام سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں، قومی سلامتی اور داخلی محاذ کے خلاف سازشیں کرتے ہیں[1]۔

انور السادات صاحب کے اس حکم کا منشا یہ ہُوا کہ انہوں نے پہلے تو خود ہی وطنی اتحاد اور آزادی اور جمہوریت کی دُہائی دی اور پھر خود ہی قومی وحدت کو دو قسموں میں بانٹ دیا۔ ایک قسم کو ہر طرح کے حقوق اور آزادیاں دے دی گئیں اس لیے کہ وہ اشتراکیت پسند ہے۔ اور دوسری قسم سیاسی آزادی سے محروم کر دی گئی اور اس سے شہری حقوق اور آزادیاں چھین لی گئیں اس لیے کہ وہ

---

[1] الحیات ۱۳ جون ۱۹۷۱ء

"اشتراکیت کی دشمن ہے اور اشتراکی انقلاب کے لیے روڑا ہے"۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انور السادات نے نظام میں "مکمل تبدیلی" کا جو نعرہ بلند کیا تھا اُسے ترک کر دیا ہے اور اب سابقہ نظام کو بحال رکھتے ہوتے اشخاص کی تبدیلی پر اکتفا کر لیا ہے اور جزوی پیوندکاری کو اپنا اصل راستہ قرار دے دیا ہے۔

یہ کیوں ہوا؟ اس کی وجہ بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ ۱۰ رجون ۱۹۷۱ء کو سادات نے "سیاسی عزل" کا حکمنامہ جاری کیا ہے۔ اس حکم نامے کے اجراء سے صرف ۲ ہفتے پیشتر یعنی ۲۵ رمئی ۱۹۷۱ء کو ماسکو کا صدر پوڈ گورنی ایک بھاری بھرکم وفد لے کر مصر آیا اور حکومت مصر کے ساتھ "دوستی اور تعاون" کا ایک معاہدہ طے کیا جس کی مدت ۱۵ سال رکھی گئی ہے اور اس کے بعد ہر پانچ سال کے وقفے پر اُس کی تجدید ہوتی رہے گی۔ الحیاۃ (۳۰ رمئی ۱۹۷۱ء) کے مطابق "صدر پوڈ گورنی جب قاہرہ کے ہوائی اڈا پر اترا تو اُس کے چہرہ پر قلق اور کبیدگی خاطر کے آثار نمایاں تھے کیونکہ اُس کے تمام دوست (علی صبری وغیرہ) جیلوں میں ڈالے جا چکے تھے۔ لیکن جب وہ واپس ہوا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا کیونکہ اُس نے قاہرہ میں جو عظیم اور سریع کامیابی حاصل کی ہے وہ اُس کی توقعات سے بہت اونچی ہے"۔ مصر کو عرصۂ طویل کے لیے اشتراکی بلاک کا خیمہ بردار بنا دیا گیا اور ماسکو جس مقصد کے لیے علی صبری اور اس کے ساتھیوں کو تیار کر رہا تھا وہ مقصد سادات کے ذریعے بدرجۂ اتم حاصل ہو گیا۔ اب ماسکو کو علی صبری اور شعراوی جمعہ اور سامی شرف کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے ساتھ مصر کی حکومت جو چاہے سلوک کرے۔ ماسکو نے جو عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے اس سے صرف موجودہ کمیونسٹ حکومت کے دیرینہ خواب کی تکمیل ہی نہیں ہوئی بلکہ روسیوں کی وہ آرزو پوڈ گورنی کے ہاتھوں پوری ہو گئی جو پطرس اعظم کے عہد سے لے کر بالشویک انقلاب تک اور بالشویک انقلاب سے لے کر آج تک ہر ہر مرحلے میں وہ اپنے سینوں کے اندر پالتے رہے ہیں۔ روسی لیڈر اسی غرض کے لیے مشرق اوسط کے اندر عرصۂ دراز سے اپنے اعوان و انصار پیدا کرتے رہے ہیں۔ جمال عبدالناصر کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی مگر بایں ہمہ جمال عبدالناصر نے کسی طویل المیعاد تحریری معاہدہ کے ذریعہ سے مصر کو روس کا باجگذار نہیں بنایا تھا۔ مصر میں علی صبری اور اس کے رفقاء اور شام میں یوسف زعین اور اس کے اعوان برابر ایسی فضا مہیا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ روس مشرق اوسط کے اندر اپنے پنجے زیادہ سے زیادہ

گھر سے کرے۔ اور اگر یوسف زعین اور اس کے اعوان کا سقوط نہ ہوتا تو زیادہ رجحان یہی تھا کہ ماسکو کی اس دستاویز پر سب سے پہلے شام کے دستخط ہوتے۔ مگر مصر میں علی صبری اور اس کے ساتھیوں کے سقوط کے باوجود انور السادات کو یہ خدمت سر انجام دینی پڑی۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وادی نیل پہلے ہی روس کے فوجی ماہرین، روسی اسلحہ، روسی سرمائے اور روسی منصوبوں کے بوجھ کے نیچے دب رہی ہے۔ اس وقت مصر میں روس کے فوجی ماہرین کی تعداد ۱۶ ہزار سے لے کر ۱۹ ہزار تک ہے[1]۔ جس ملک کی اپنی فوج ۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے وہاں اتنی بڑی تعداد میں روسی فوجی ماہرین کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ آئندہ جو مسئلہ بھی اٹھے گا اُس کا فیصلہ قاہرہ میں نہیں ماسکو میں ہوگا۔ اسی طرح مصر ۲ ارب ڈالر کا اسلحہ قرض لے چکا ہے اور ڈھائی ارب سے زیادہ ڈالر روس نے مختلف منصوبوں میں لگا رکھے ہیں۔ یہ اعداد و شمار مصر کی داخلی سیاست کا نقشہ تیار کرنے میں مؤثر عامل ثابت ہوں گے۔ چنانچہ اس معاہدے میں بصراحت یہ تحریر کر دیا گیا ہے کہ "مصر کو سوشلسٹ معاشرے میں پوری طرح تبدیل کیا جائے گا"[2]۔

اس معاہدے کا اثر یہ ہوا کہ انور السادات نے ایک تو اشتراکی انقلاب کو واضح طور پر اپنی حکومت کا نقطۂ نظر قرار دے دیا ہے۔ دوسرے سوشلسٹ یونین کے سوا کسی سیاسی پارٹی کے قیام کی اجازت نہیں دی اور تمام سیاستدانوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر وہ سیاست بازی کرنا چاہتے ہیں تو سوشلسٹ یونین کے دروازے ان کے لیے کھلے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں مصر کے اندر اور کوئی پلیٹ فارم مہیا نہیں کیا جائے گا۔ تیسرا اثر یہ ہوا ہے کہ "رجعت پسند" حلقوں کو سیاسی اور شہری حقوق سے محروم قرار دے دیا گیا ہے۔ اور چوتھا اثر یہ ہوا ہے کہ انور السادات صاحب نے اپنے اسلام کی حدود بھی متعین کر دی ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں سوشلسٹ یونین کی نیشنل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "میں جب اسلام کی دعوت پیش کرتا ہوں تو اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں خدا پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے"[3]۔

---

[1] الحیات۔ ۳۰ جولائی ۱۹۷۱ء   [3] الحیات ایضاً

[2] الشباب العربی، قاہرہ۔ ۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء

اسلام کا معاشی نظام

ہی حقیقی معاشی انصاف اور اجتماعی عدل کا ضامن ہے

اس کے تفصیلی مطالعے کے لیے حسبِ ذیل کتب ملاحظہ کیجیے

		سستا	اعلیٰ
۱۔ معاشیاتِ اسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۶-۷۵ روپے	۱۰-۵۰ روپے
۲۔ سود	״	۵-۰۰ ״	۸-۰۰ ״
۳۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات	״	۱-۷۵ ״	
۴۔ مسئلہ ملکیت زمین	״	۱-۲۵ ״	
۵۔ قرآن کی معاشی تعلیمات	״	۰۰-۵۰ پیسے	
۶۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	״	۰۰-۵۰ ״	
۷۔ اسلامی نظمِ معیشت اور اسکے اصول و مقاصد	״	۰۰-۳۵ ״	
۸۔ اسلام اور عدلِ اجتماعی	״	۰۰-۴۰ ״	
۹۔ اسلام کا نظریہ ملکیت حصہ اول	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	۴-۵۰ روپے	۸-۵۰ ״
۱۰۔ ״ ״ ״ ״ حصہ دوم	״	۴-۵۰ ״	۷-۵۰ ״
۱۱۔ غیر سودی بنکاری	״	۳-۲۵ ״	۵-۲۵ ״
۱۲۔ شرکت و مضاربت	״	۲-۰۰ ״	۳-۰۰ ״
۱۳۔ اسلام کی اقتصادی پالیسی	״	۰۰-۷۰ پیسے	
۱۴۔ اسلام میں عدلِ اجتماعی	سید قطب شہید ترجمہ: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	۹-۰۰ روپے	۱۵-۰۰ ״

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (مغربی پاکستان) فون ۶۸۳۴۱

شاخ: ۱۶-ا، بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) فون ۲۸۳۰۷۹